فہرست

عرض ناشر

ہوائی قلعے کرشن چندر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ انگریزی ادب میں انشائے لطیف "Essays" کی صنف کو نہایت وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اردو میں خالص "Essays" انشائے لطیف ہنوز ابتدائی حالت میں ہے اور اس کی طرف بہت کم ادیبوں نے توجہ کی ہے۔ ان ادیبوں میں پطرس، رشید احمد صدیقی، حسرت اور کرشن چندر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر کی ادبی زندگی کو شروع ہوتے بمشکل چار سال گزرے ہوں گے۔ اُن کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۳۶ء میں ہمایوں میں شائع ہوا تھا۔ ان چار سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے قابل رشک کامیابی حاصل کی ہے اور اردو ادب میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔ افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند کے بعد شاید ہی کسی اور ادیب کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہو جتنی کہ کرشن چندر حاصل کر چکے ہیں۔ اور ان کے مضامین کی مقبولیت کا بھی یہی عالم ہے جب ان کا پہلا مضمون "ہوائی قلعے"

عرضِ ناشر

ہمایوں میں شائع ہوا۔ نو مدیرِ "ہمایوں" نے ان الفاظ میں اسے سراہا۔

"مسٹر کرشن چندر کا شمار اُردو کے موجودہ ادبا کی صفِ اوّل میں ہو سکتا ہے

اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زوردار زبان سیرحاصل اور رنگین تخیل اور

گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا

ایک زبردست ادیب ثابت ہو گا۔"

کرشن چندر کی متین اور شُستہ ظرافت کے سبھی نقاد قائل ہیں۔ مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی، طنزیہ انداز نگارش اور افسانوی تخیل ان کی تحریر اور اسلوب بیان کے خاص لوازم ہیں وہ ایک جدت طراز ادیب ہیں مفکر ہیں جو کچھ لکھتے ہیں اُسے دل کی گہرائیوں سے سوچتے ہیں اور پُر خلوص لہجے میں اُسے بیان کرتے ہیں "شدت تاثر" ان کی تحریر کا طغرائے امتیاز ہے ان مضامین میں آپ کو جہاں لطیفے لطیف کے نہایت نفیس نمونے ملینگے وہاں آپ ان کی افسانوی دلکشی سے بھی محفوظ ہونگے۔

کرشن چندر دسمبر ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال کی ہے فارمن کرسچن کالج لاہور سے (انگریزی ادبیات) پاس کر کے ۱۹۳۶ء میں ایل ایل۔ بی کا امتحان لا کالج لاہور سے پاس کیا۔ ان کے افسانے کا پہلا مجموعہ "طلسم خیال" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "نظارے" جون ۱۹۴۰ء میں ادارۂ ادبی دنیا نے شائع کیا۔ "ہوائی قلعے" ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جسے شائع کرنے کا فخر ادارۂ اردو بک سٹال کو ہے۔

ظہیر

غلط فہمی

شیرانہ ۲۴ فروری ۱۹۳۷ء عیسوی

جن لوگوں کے متعلق عوام غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ ان میں ایک میں بھی
ہوں۔ کہنے کو تو میں ایک گھٹیا سے کالج میں رذیل قسم کا پروفیسر ہوں۔ پچھتر روپیہ تنخواہ
ملتی ہے۔ اور سارا دن ایف اے کے لڑکوں کی انگریزی املا درست کرنے میں گزرتا
ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ میرے گاؤں کے لوگ، میرے معمولی واقف کار اور چند
وہ پرانے احباب جو کبھی ایف اے یا بی اے میں ہم جماعت تھے۔ اور اب کسی دُور
افتادہ شہر میں کسی پرائیویٹ فرم میں کلرکی کی آسامی پر سڑ رہے ہیں۔ مجھے کسی فلم کے ہیرو

سے کم نہیں سمجھتے۔ اگر گاؤں والوں میں سے کسی کی پیشی لاہور کی کسی کچہری میں پڑ جائے تو وہ کم بخت وہیں گاؤں والوں میں سے میرا لاہور کا پتہ پوچھ آتا ہے۔ اور پھر نہایت فخر سے تانگے والے کو کہتا ہے۔ "چل نمبر ۴۴ چنگڑ محلہ پروفیسر صاحب کی کوٹھی جانا ہے گویا سارے لاہور میں ایک میں ہی پروفیسر رہ گیا ہوں۔ اور وہ جو گنجے سروں والے پانچ سو روپیہ پاتے ہیں محض جھک مارتے ہیں اور نرے چور ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کم از کم میری آدھی تنخواہ انہی بن بلائے مہمانوں کی خاطر تواضع میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور جس کا صلہ مجھے صرف اتنا ملتا ہے کہ واپس گاؤں جا کر میرے متعلق شیخیاں بگھاری جاتی ہیں۔ "میں وہاں لاہور پیشی بھی گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کے گھر پہ ٹھہرا تھا۔ انہوں نے میری بہت بہت خاطر کی۔ دو دن ملنے نہ دیا۔ بہت سعادت مند ہے۔ غرور نام کو نہیں چھو گیا۔"

گو میری تنخواہ صرف پچہتر روپیہ ہے۔ مگر سوائے چند ایک دیرینہ احباب کے ہر شخص کو میری تنخواہ کے متعلق بھی غلط فہمی ہے۔ وہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ میں خدا نہ کرے کم از کم دو ڈھائی سو روپیہ تنخواہ پاتا ہوں۔ اس کا تذکرہ نہایت حاسدانہ لہجہ میں کیا جاتا ہے جسے سننے میں گو مجھے کوفت بھی ہوتی ہے۔ تو ایک قسم کی مسرت بھی۔ مثال کے طور پہ بازار میں چلتے چلتے کوئی پرانے ہم جماعت مل گئے۔ اچھی طرح سے مصافحہ ہوا اس کے بعد "یار سنا ہے، کہ تم پروفیسر ہو گئے ہو۔ (سنا ہے، گویا یقین نہیں آتا۔) یار سن کر بہت مسرت ہوئی (پروفیسر میں بنا اور مسرت ان کو ہوئی) یار، خوب عیش

کرتے ہو نا لعنی خدا تمہیں غارت کرے! اور ڈھائی سو روپیہ تنخواہ پاتے ہو۔ ذرا میری حالت دیکھو۔ لدھیانہ میں کھرڈبرڈ کمپنی میں پینتیس روپے تنخواہ لیتا ہوں۔ ایک بیوی ہے اور دو بچے۔ جان ضیق میں ہے "تم تو عیش کرتے ہو یار" دو ڈھائی سو روپے تنخواہ" غرضیکہ احباب" دو ڈھائی سو روپوں" کا ذکر اس دلی خلوص اور یقین کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہ اکثر مجھے بھی اطمینان سا ہو جاتا ہے۔ اور میں سمجھ لیتا ہوں۔ کہ واقعی میری تنخواہ اتنی ہی ہے۔ مگر جب مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے۔ تو یہ دلفریب سراب پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے میری علمی قابلیت کے متعلق مختلف نظریے قائم کر رکھے ہیں۔ اور میری ہزار کوششوں پر بھی وہ ان نظریوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ گاؤں والے خصوصاً تو یہ سمجھ چکے ہیں۔ کہ دنیا بھر کے علوم و فنون جانتا ہوں اگر کسی نے اپریشن کرانا ہو۔ اگر کسی کا مقدمہ ہو۔ کسی کو دمے کی بیماری ہو۔ کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو۔ وہ فوراً لاہور آ کر مجھ سے صلاح طلب کرتا ہے۔ اور مجھے چار و ناچار جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ اوّل تو سچ سننے کو کوئی تیار نہیں۔ اور پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر لوگ آپ پر خواہ مخواہ ایمان لے آئیں تو موسے بننے میں کونسی وقت رہ جاتی ہے اور پھر میں تو کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ عدم تشدد کے فلسفے، بورڈنگ کی روٹیوں اور غلط املا سے بھری ہوئی کاپیوں نے مجھے بے حد بزدل بنا دیا ہے۔

بعض افراد کے نزدیک میرا پروفیسر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ میں لاہور

کے سب بڑے بڑے حاکموں، نوابوں، رئیسوں اور یونیورسٹی کے ممتحنوں کو جانتا ہوں
کوئی چاہتا ہے کہ میں ڈپٹی کمشنر سے اس کی ملاقات کرا دوں۔ کوئی کسی بیمہ کمپنی میں
نوکری کا متلاشی ہے۔ کوئی نواب جھنگڑ خاں کی کوٹھی کو تعمیر کرنے کا ٹھیکہ مانگتا ہے۔
اور مجھ سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک سے ہاں کر دیتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تو
بلا ٹل جاتی ہے۔ بعد میں بہت باتیں گھڑنا پڑتی ہیں۔ مگر بعد میں یہی غنیمت ہے ابھی
اس دن کا واقعہ ہے۔ میرے دوست شبیر علی خاں بلوچ تشریف لے آئے۔ شاید
تیسری جماعت میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ اب اتنے سالوں بعد
آج ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے "آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں شبیر علی خاں بلوچ ہوں،
میں آپ کے ساتھ تیسری جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ یاد آیا؟"

خوب یاد آیا۔ یہ وہی صاحب تھے۔ جو اکثر میرے پیسے چھین لیا کرتے تھے۔
میری جیب سے ریوڑیاں نکال کر کھا جایا کرتے تھے۔ مذاق مذاق میں مجھے سکول کے
باہر گندی نالی میں گرا دیا کرتے تھے۔

اوہو، "آپ ہی شبیر علی خاں ہیں"۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ "کہئے مزاج کیسے ہیں
سوڈا دوڈا منگواؤں؟"

سوڈا وغیرہ تو بعد میں پی لوں گا۔ شبیر علی خاں نے کہا۔ میں نے سنا تھا کہ آپ
یہاں پروفیسری کرتے ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ میں آج کل نارمل کا امتحان دے رہا
ہوں۔ جغرافیہ کا پرچہ بہت برا ہوا ہے۔ پاس ہونے کی مطلق امید نہیں۔ میں نے سوچا

کہ کیوں نہ آپ کے پاس چلوں۔ آپ خان بہادر رچ۔ کو تو جانتے ہونگے۔ اگر مل ملا کے کام ہو جائے ——"

میں نے دل میں سوچا۔ کہاں خان بہادر رچ —— اور کہاں میں، نہ ہی تو میں ان کو جانتا ہوں۔ اور نہ ہی ملنے ملانے سے یہ کام ہو سکتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ میں ذرا بزدل واقع ہوا ہوں۔ اس لئے میں نے جھٹ کہہ دیا۔ "یہ تو معمولی سی بات ہے۔ خان بہادر رچ —— کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ ابھی کل ہی میرے ہاں چائے پینے آئے تھے۔ اگر آپ اُس وقت آجاتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔"

خدایا تیرا ہزار ہزار شکر۔ شیر علی خان بلوچ نے گرج کر کہا۔ "آپ پھر ان کو ملینگے نا۔ میرا رول نمبر لکھ لیجئے۔ نمبر ۳۶ ہے ۳۶ بھولئے گا نہیں۔"

کبھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ۳۶ نمبر مجھے اچھی طرح یاد رہیگا۔ لکھنے کی کیا ضرورت ہے میں کل ہی خان بہادر کو کہہ دونگا۔

اچھا تو میں چلتا ہوں۔

واہ صاحب۔ آئے بھی اور چل بھی دیے۔ ایک دو دن تو ٹھہریے۔ ضرور ٹھہرتا ضرور ٹھہرتا۔ شیر علی خاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مگر کل دوسرا پرچہ ہے۔ پھر کبھی حاضر ہونگا۔

× × × × × × × × × ×

شیر علی خان چلے گئے۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کم از کم میرے ذہن سے تو یہ واقعہ بالکل اتر گیا۔ لیکن ایک روز کیا ہوا۔ کہ عین رات کے گیارہ بجے کسی نے زور

سے دروازہ کھڑکھڑایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا شبیر علی خان تھا۔ "آئیے۔ آئیے"
میں نے بناوٹ کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

شبیر علی خان نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ میں اسی بات کے لئے حاضر ہوا ہوں کہئے کچھ بنا؟

سب کام ٹھیک ہو گیا۔ آپ تسلی رکھیں۔ میں نے اسی دم جھوٹ موٹ کہا۔
کیا انہوں نے مجھ کو پاس کر دیا۔

ہاں ہاں۔ میں خان بہادر کے پاس گیا تھا۔ وہ کہنے لگے۔ آؤ یار مدت کے بعد آئے ہو۔ میں نے کہا۔ ایک لڑکے کو پاس کر دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے بیس نمبر اور دے دیئے۔ اندر تشریف لائیے نا۔ میں نے شبیر علی خان سے کہا۔

میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ شبیر علی خان نے کہا۔ میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھول سکتا۔

کس کا احسان دوست! میں نے انکساری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ یہ تو ایک بالکل معمولی سی بات تھی۔

ہاں تو مگر آپ کو ٹھیک پتہ ہے نا۔ شبیر علی خاں نے کہا۔ بیس نمبر دیئے تھے۔

ہاں ہاں پورے بیس۔

میرا رول نمبر تو آپ کو یاد تھا؟ بھلا کیا تھا؟ شبیر علی خان نے کہا۔

یہی نمبر — نمبر — کمبخت یاد نہیں آتا۔ یہی نمبر ۲۷ تھا۔

نمبر ۳۷ شبیر علی خان بلوچ نے چیخ کر کہا۔ میرا نمبر تو ۳۶ تھا۔

ہائیں نمبر ۳۶ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اف کتنی غلطی ہوئی۔ میں نے ۳۶ کو ۳۷ سمجھ لیا۔

شبیر علی خاں بولے۔ میں نے آپ کو اسی وقت کہا تھا۔ کہ آپ میرا رول نمبر لکھ لیں۔ مگر آپ نے نہ لکھا۔ نمبر ۳۷ والا تو پہلے ہی بہت لائق لڑکا ہے۔

ادھر مجھے ٹھیک یاد آیا۔ میں نے جلدی سے جواب دیا۔ کتنی بھول ہوئی۔ تبھی تو خان بہادر کہتے تھے۔ اس لڑکے کو پہلے ہی بہت نمبر ملے ہیں۔ تم اسے بیس نمبر اور کس لئے دینا چاہتے ہو۔ کیا اسے یونیورسٹی میں اوّل کرانا چاہتے ہو۔ تو میں نے کہا تھا۔ خان بہادر صاحب آپ اسے میری خاطر بیس نمبر اور دے دیجئے۔ اُف اب خیال آتا ہے نمبر ۳۷ تھا کتنی غلطی ہوئی۔

پھر شبیر علی خان نے پوچھا۔

آپ مطلق فکر نہ کریں۔ میں نے اُسے تسلی دے کر کہا۔ کل ہی خان بہادر کے ہاں جا کر انہیں حقیقت سے واضح کر دونگا۔ اور اس لڑکے کے بیس نمبر کاٹ کر آپ کو دے دیئے جائینگے۔"

شبیر علی خان چلا گیا۔ اور میں پھر اس واقعہ کو بھول گیا۔ ایک مہینہ کے بعد اچانک مجھے شبیر علی خان کا خط آیا۔ وہ پاس ہو گیا تھا۔ اور اس نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا۔

شیر علی خان کے اس واقعہ کے بعد لوگوں کو پورا یقین ہو گیا ہے۔ کہ یونیورسٹی میری زر خرید غلام ہے۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے ماموں مجھے ملنے کے لئے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ امسال عزیزہ پرکاش چند نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ انگریزی اور حساب کے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ یوں تو جماعت میں خاصا لائق سمجھا جاتا ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہیں فیل نہ ہو جائے۔ اس کا ذرا خیال رکھنا۔ اور ممتحنوں سے مل کر ——

میں نے سر ہلا کر کہا۔ اوہ۔ بالکل فکر نہ کریں۔ پرکاش ضرور پاس ہو جائے گا۔

اس کے بعد ماموں جان کے کئی خط آئے۔ اور ہر خط میں یہ فقرہ ہوتا تھا۔ "میں نے وہ بات جو آپ کو لاہور کہی تھی۔ اس کا دھیان رکھنا" اور کبھی کبھی مامی جان بھی لکھ بھیجتی تھیں۔ پرکاش کا خیال رکھنا۔ پرکاش گویا تمہارا اپنا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر تم نے اس کو پاس نہ کرایا تو میں ساری عمر تم سے نہ بولوں گی" وغیرہ وغیرہ۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پرکاش چند پاس ہو گیا۔ بس اب میرے ماموں سب کو سناتے پھرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے پاس کرایا ہے آخر اپنے عزیزوں کا اتنا بھی فائدہ نہ ہو تو اور کیا ہو گا۔ اور ادھر جب پرکاش چند ایف۔ اے میں داخل ہونے کے لئے آیا۔ تو میں نے تہدید کے انداز میں اس سے پوچھا۔ کیوں بے پرکاش یہ تو ہسٹری کے پرچے میں کیا اوٹ پٹانگ لکھ آیا تھا۔ اکبر کی جگہ اشوک اور وارن ہسٹنگز کی جگہ لارڈ ڈلہوزی کا عہد حکومت کیوں لکھ دیا۔ پھر انگریزی کے پرچے میں تو سے

ہجے اتنے غلط کیوں تھے۔ عزیز کام کرنا سیکھو۔ ورنہ ہر سال نومیں پاس کرانے سے رہا۔
اور بیچارے پرکاش چند نے سر جھکا کر کہا۔ جی غلطیاں کیا بتاؤں ہو ہی گئیں۔

× × × × × × × ×

مگر لڑکے ہر بار پاس نہیں ہوتے۔ تو میرے پاس اس کے لئے بھی گھڑے گھڑائے جواب موجود ہیں۔
اجی آپ کا لڑکا کیا پاس ہوتا۔ آپ نے تو الٹا مجھی کو شرمندہ کرایا۔ میں لالہ ایشری پرشاد کے پاس گیا۔ تو انہوں نے فوراً سب پرچے میرے ہاتھ میں دے دیئے اور کہا تم خود ہی انصاف سے جتنے نمبر چاہو دے دو۔ اب میں کیا کرتا۔ کچھ لکھا ہوتا۔ تو نمبر دیتا۔ جو جواب دیکھو غلط۔ املا غلط، ہجے، معانی غلط، سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لونڈا سارا سال کیا کرتا رہا ہے۔
کرتا کیا رہا ہے، لڑکے کا باپ چھڑی ہاتھ میں لے کر جواب دیتا ہے بدمعاش کہیں کا۔ سارا سال تاش کھیلتا رہا ہے۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ یہ پاس کیسے ہوتا۔ کیوں بے حرامی!
اب اسی طرح سے کئی لڑکوں کو پٹوا چکا ہوں۔ پھر بھی لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

× × × × × × × ×

میں نے تنگ آ کر پروفیسری چھوڑ دی ہے۔ اب میں انارکلی میں آٹے،

تیل، نون کی دکان کرتا ہوں۔ مگر اس پر بھی لوگوں کی غلط فہمی دور نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ابھی تک پروفیسر ہوں اور اس دکان پر یونہی چلا آتا ہوں یا شاید یہ میرے کسی دوست کی دکان ہے۔ اگر میں کسی کو سچی بات بتا بھی دوں۔ تو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اس لئے خوب کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہا! ہا! پروفیسر صاحب آپ تو نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔

اس دنیا میں سچائی جھوٹ ہے اور جھوٹ سچائی "

گانا

ہمایوں جولائی ۱۹۳۸ء عیسوی

گانا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم تو وہ ہے جو متوسط درجے کے گھروں
میں عام طور پر پائی جاتی ہے، دیکھی جاتی ہے، اور ہاں، اگر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ
نہ ہو تو سُنی بھی جاتی ہے، عام طور پر ایک گھٹیا سا رذیل ہارمونیم ہوتا ہے، یوں تو موسیقی
کے اعتبار سے ہر ہارمونیم ہی فطرۃً رذیل ہوتا ہے، لیکن پھر اس رذالت کے بھی
کئی درجے ہیں، اور متوسط گھروں میں اکثر باجے درجہ سوم اور چہارم کے ہوتے ہیں
مگر خیر یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی، اصلی چیز تو "گانا" ہے، گانے کے لئے متوسط درجے

کے گھر میں ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے، بہت سے گھروں میں شاید ایک سے زیادہ ہوتی ہونگی، لیکن اوسط کے اعتبار سے ایک ہی کافی ہے، آپ اس لڑکی کو جو چاہیے کہہ کر پکار لیجیے، ببلا، کملا، زبیدہ، پرکاش کور، مطلب ایک ہی ہے یعنی اوسط گھرانے کی لڑکی جو گانا جانتی ہے اور جس پر سارے "گھر والوں" کو ناز ہے، اب اس لڑکی کو آپ ذہن میں رکھئے اور پھر اُس ہارمونیم کی طرف بھی خیال کیجیے جو اُس طاقچے میں لکڑی کے صندوق میں جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا ہے نہایت احتیاط سے رکھا ہوا ہے۔

متوسط درجے کے گھروں میں گانا عموماً کھانا کھانے کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کا محرک بیچارا وہ غریب مہمان ہوتا ہے۔ جو بھولا بھٹکا کبھی متوسط درجے کے گھر میں آنکلتا ہے، پیٹ پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر اور چند لمبی لمبی کھٹی ڈکاریں لیکر میزبان مہمان سے پوچھتا ہے:-

"تاش واش کھیلوگے؟"

"نہیں"

"ایک آدھ بازی برج کی؟"

مہمان ایک جمائی لے کر جواب دیتا ہے "جب سے سکرٹریٹ میں ملازم ہوا ہوں، برج بھی بھلا بیٹھا ہوں۔"

"اچھا تو پھر ـــــ جانمنے، گراموفون اُٹھا لا۔"

جاپان کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کی محنت و مشقت میں نہیں، نہ اس امر میں کہ انہوں نے مغربی تہذیب و سائنس کو اپنایا ہے، بلکہ محض اس امر میں ہے کہ وہ لوگ ہندوستان کے متوسط طبقے کو جاپانی گراموفون، جاپانی کریپ، جاپانی سائیکل، جاپانی گھڑیاں، جاپانی تصویریں اور اسی قسم کی ہزاروں سستی اور بے کار چیزیں بھیج کر اُسے ہمیشہ فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے ہیں، سیاسی غلامی اور ذہنی غلامی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مثال کے طور پر اس گراموفون کو لیجئے، دیکھنے میں سُبک، خوشنما، بالکل ریڈیو معلوم ہوتا ہے، قیمت صرف پچیس روپے دسویں بارھویں دن اس کا فنر FUNNER ٹوٹ جاتا ہے، مگر یہ ایک بالکل فروعی بات ہے، اصل بات تو ہے گانا! "یہ ناچ آپ نے سُنا، پتلی کمر توری بل کھائے جائے" ——— "جی میں نے فلم دیکھا تھا" "اوہ ——— اچھا یہ ریکارڈ: اک میرے ماہی دی مُندری ——— بالو، یہ آپ نے نہیں سنا ہوگا"

"اچھا سنا دیجئے"

ریکارڈ بجنا شروع ہوتا ہے، آدھا ریکارڈ ختم ہونے کے بعد فنر ٹوٹ جاتا ہے، یا یونہی گھرڑ، گھرڑ، گھرڑ کی آوازیں سنائی دینے لگ جاتی ہیں۔

میزبان برا سا منہ بنا کر کہتا ہے: ارے مُنّے ——— گراموفون بند کر دو، اور پھر مسکرا کر) بولا! (یا کہا): زبیدہ: پر کاش کورا) انہیں گانا سنا دو بیٹی!

ببلا آخر منو سولہ گھرانے کی لڑکی ہے، حیا سے کانوں تک سُرخ سرخ ہو جاتی ہے، اور سر جھکا لیتی ہے، اس طرح کہ بیچارے مہمان کو پورا یقین ہو جائے، کہ بیچاری ببلا گانا تو کجا بولنا بھی نہیں جانتی،

میزبان دوسری بار پھر پیار سے مگر ذرا اونچی آواز میں کہتا ہے، ببلا، جا ہارمونیم لے آنا، وہ اُس طاقچے میں دھرا ہے"

اور مہمان جس کی پلکیں نیند سے جھکی جا رہی ہیں آہستہ سے ہمت بڑھانے کو کہہ دیتا ہے، ہاں بہن ببلا! کچھ سُنا دو۔ سُنا ہے تم بہت اچھا گاتی ہو، (پھر جلدی سے یہ فقرہ جوڑ دیتا ہے) رام بھروسے کی ماں سے سُنا تھا۔

اب یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، نہ بیچاری ببلا اچھی طرح گا سکتی ہے اور نہ رام بھروسے کی ماں گانا سن سکتی ہے کیونکہ وہ بیچاری تو بہری ہے، اور پھر "بہن ببلا"! اس کا کیا کیا جائے کہ ہندوستان ہے جہاں عورتوں کی صرف دو قسمیں ہیں، ایک قسم ماں، دوسری بہن، اگر خوبصورت ہو، جوان ہو، تو بہن اور اگر بدصورت، ادھیڑ یا بوڑھی ہو تو اماں، بس اور تیسری قسم کوئی نہیں، کیونکہ جب عورت کی شادی ہو جاتے تو پھر وہ عورت نہیں رہتی، بلکہ پاؤں کی جوتی بنجاتی ہے

اب ببلا گاتی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے، اماں مونڈھے پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں لئے لڑکی کی طرف دیکھ رہی ہے کہ کہیں ببلا نگاہ اٹھا کر مہمان کی طرف دیکھ تو نہیں رہی! ...... مدھم باریک آواز میں ببلا گا رہی ہے،

ہارمونیم الگ اپنے سُروں کو بجا رہا ہے۔

گلا ..... ہاں گلا ..... کاٹ لو ..... گلبدان دھیرے دھیرے

دھیرے دھیرے .....

مہمان گانا سُنتے سُنتے تصور کی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ قصاب تیز چھری گردن پر رکھے بیٹھا ہے اور نیچے بکری میا میا کہتی ہے "گلا ... ہاں گلا .... کاٹ لو گلبدان! دھیرے .... دھیرے" ایک قصاب کیلئے "گلبدن" کی تشبیہ کتنی نازک اور پیاری ہے، یہ شاعر لوگ بھی عجب دماغ رکھتے ہیں، مہمان ابھی یہاں تک ہی سوچ سکتا ہے کہ ببلا دوسرا گانا شروع کر دیتی ہے۔ اب اک نئی لے ہے، مدھم اور غمگین۔

تُم میرے ..... تم میرے ..... میں تیری

اُمل ..... اُول ..... اُوں

تم میرے ..... تم میرے ..... میں تیری

اُوں ..... اُوں ..... اُوں

اور بیچارہ مہمان حیران ہو کر سوچتا ہے کہ اس اُوں اُوں کا کیا مطلب، مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا، آخر جرأت کر کے پوچھ لیتا ہے اور ..... بہن ببلا! اس دوسرے بند کا کیا مطلب؟

اور بہن ببلا لجا کر کہتی ہے، جی، میں نے فلم میں ایسے ہی

متوسط طبقے سے اُوپر گانا اپنی ہیئت یکسر بدل لیتا ہے، اس کی تمام جزئیات تبدیل ہو جاتی ہیں، ہارمونیم کی جگہ گنبد کی طرح گونجتا ہوا ارگن "یہ میں نے بارہ سو روپے میں خریدا تھا، کچھ اتنا بُرا بھی تو نہیں" شرمیلی مِلائی کی جگہ ایک شوخ و شنگ تتلی، رنگین ہونٹ، بیباک نگاہیں، آپ کیا سننا پسند کریں گے ؟ بلو ڈینیوب، یا ٹریس میڈر کا نغمہ، اچھا، آپ مغربی موسیقی کو پسند نہیں کرتے ..... مگر سہگل تو کب کا پرانا ہو چکا..... ارگن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے ..... اُس دن آیا مساری جو تھیکار لے کا ایک ریکارڈ لے آئیں، یونہی پسند آگیا۔ جیسے ریڈیو پر بھی کبھی کبھی کوئی اچھی چیز آ ہی جاتی ہے، انگلیاں پھیرتے پھیرتے گانا شروع کر دیتی ہیں، اور گانے کے دَوران میں بار بار دیکھتی جاتی ہیں، آپ کی طرف، آپ مُسکرا مُسکرا کر داد دیتے ہیں اور گانا ختم ہونے پر تالی بجاتے ہیں، "[illegible]!" "آپ کس سے گانا سیکھتی ہیں"؛ "بنّے خاں لکھنوی"، "وہ تو بڑے اُستاد ہیں اپنے فن کے"، "ہاں اڑھائی سَو سے کم نہیں لیتے، پاپا کہتے ہیں گانا سیکھنا ہو تو کسی لکھنوی اُستاد سے سیکھا جائے۔ ناچ بھی وہی سکھاتے ہیں!"

دراصل متوسط درجے سے اوپر گانا کم اور ناچنا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

اور پھر گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، اس کا نام ہے "کلاسیکل میوزک"۔

. . . .

.... عجیب شے ہوتی ہے یہ بھی، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا ہے۔ شاید اسی لئے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، خاص کر وہ گروہ جو اپنے آپ کو ادب اور آرٹ کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے، کلاسیکل میوزک کے سوا اور کسی شے کو پسند نہیں کرتا کوئی "چیز" سنائیے؛ یہ "چیز" دوسرا نام ہے کلاسیکل میوزک کا؛ "چیز" میں آکر گانا اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کوئی "چیز" سننے پر اس قدر مصر رہتا ہے۔ ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کلاسیکل میوزک کا ماہر ثابت کرے، "اس دن ہم نے وائی، ایم، سی، اے میں جی، و شو ار اور جہانگیر کا گانا سُنا، کیا مُصرید الا یا ہے، بھاگ اور سورٹھ، جی، مالکونس اور تلنگ، واہ، واہ، یا پھر اُس دن لطف آیا تھا، جو ہم نے پیارو قوال کو نواب صاحب کو دعوت دینے کے موقع پر اپنے ہاں مدعو کیا تھا، واہ، واہ، بیٹھے نے کیا کیا تانیں اُڑائی تھیں، کیا کیا "کلیاں" بنائی تھیں۔ بھیم اور جگ، بھیروں اور درباری، اور مانڈ..... بس مانڈ تو پیارو قوال پر ختم ہے!"

میرا اپنا تجربہ ہے کہ کلاسیکل میوزک کا ماہر بننے کے لئے کچھ زیادہ وقت پیش نہیں آتی۔ آٹھ دس راگ راگنیوں کے نام یاد ہوں، چیز، کلی، تان، کھیرن، پلٹا اور اس قسم کے آٹھ دس فنی نام یاد کر لئے جائیں۔ طبلہ کی تھاپ پر کبھی کبھی سر ہلا دیا جائے، لوگ کہیں دیکھئے، بنّے صاحب بھیم کی گت کیا خوب بجاتے ہیں آپ

کہیں، نہیں صاحب ہم تو طبلے والے کی تھاپ پر مرے جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر مجلس میں لوگ آپ کو کلاسیکل میوزک کا استاد سمجھنے لگ جائیں گے، ہر ایک گویا آپ کی طرف ہی بازو ہلا ہلا کر گائے گا "تانی دھا، فی پا پا گا دھا، تانی دھا، تانی دھا!" اور آپ سر ہلا کر کہیں گے بھئی، واہ، واہ، واہ! چیز کس خوبی سے اٹھائی ہے، بس اب "الٹ کلیان" سنا دو تو روح خوش ہو جائے۔

سیانوں سے سنا تھا کہ گانا روح کی غذا ہے، لیکن ان تین قسموں میں کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو روح کو بالیدگی بخش سکے، یہ سب نام و نمود کے دھندے ہیں، ان تینوں طبقوں کے لوگ گانا سنتے ہیں تاکہ موجودہ تہذیب کے ظاہری لوازم کو پورا کرسکیں، اس کے پس پردہ ڈر ہر وقت موجود رہتا ہے، مبادا کوئی انہیں جاہل، ادب اور آرٹ سے بیگانہ سمجھ لے، اسی لئے تو موٹی توند والا رئیس اور لمبی مونچھوں والا نواب اور باتیں بنانے والا پروفیسر اور سکرٹریٹ کی میز پر جھکا کر لکھنے والا کلرک، ہر ایک اپنے آپ کو گانے کا شیدائی جتاتا ہے، ——— لیکن گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، چوتھی، آخری اور سب سے نچلی، یہاں نہ ہارمونیم ہوتا ہے، نہ ستار نہ وائلن نہ آرگن، یہاں نہ کلیاں بنائی جاتی ہیں، نہ پلٹے اٹھائے جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی ڈھولک ہوتی ہے، اور پچاس ساٹھ مزدور اور ان کی عورتیں اور لڑکے اور لڑکیاں، اور ننگ دھڑنگ بچے، تالیاں بجاتے، پاؤں ہلاتے "نجریا

توری پہ بلہار، انجریا توری" ہلی جلی آوازیں ہیں، موٹی، پتلی ہلبی، کوئی گاتے گاتے کھانسنے لگ جاتا ہے، کوئی گاتے گاتے ہنسنے لگ جاتا ہے، درمیان میں ڈھولک بجتی ہے، کوئی پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر جھنجھنا رہا ہے۔ تو کوئی کانسی کے کٹورے پر پیسہ رکھ کر بجا رہا ہے، کھلا سا گندہ صحن ہے، آسمان پر ستارے اُن گھنگھروؤں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، جو کسی مست رقاصہ کے ٹخنوں سے اُتر کر اِدھر اُدھر فرش پر بکھر گئے ہو، اُن کے درمیان میں چاند ہے، جو کانسی کے کٹورے کی طرح چمک رہا ہے۔ گاتے ہوئے مزدور، چمکتا ہوا چاند، بے ہنگم لیکن پُر مسرّت نغمہ، دل کو خوش کرنے والا، دن بھر کی تھکن اُتار دینے والا، سیانوں نے سچ کہا تھا، گانا رُوح کی غذا ہے! —— لیکن کئی لوگوں کے پاس رُوح نہیں ہوتی، وہ صرف ایک خول رکھتے ہیں۔

جان پہچان

شیرازہ ۳۱ مئی و یکم جون ۱۹۳۶ء

اجنبیوں اور دشمنوں کو چھوڑ کر آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو ہوتے ہیں دوست، یعنی محض دوست، اوّل اور آخر دوست، بے تکلف، بے شرم، بے حیا، ایسے آدمیوں سے جی ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ کیونکہ آخر ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں اور پھر ساری عمر اُن کے ساتھ ہی نباہ کرنا پڑتا ہے اس لئے اپنے دوستوں میں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آتی۔

دوسری قسم کے آدمی وہ ہوتے ہیں جنہیں انگریزی میں Acquaintance

اور اردو کی عام اصطلاح میں "جان پہچان کے لوگ" کہا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ان جان پہچان کے لوگوں سے انتہائی نفرت ہے۔ میں بقول یسوع مسیح اپنے دشمن سے محبّت کر سکتا ہوں۔ مگر ان جان پہچان کے لوگوں سے خوش کلامی سے پیش آنا میرے لئے ایک نہایت دشوار امر ہو گیا ہے۔ گو یہ لوگ آپ کو کبھی کبھار ملتے ہیں۔ مگر جب ملتے ہیں تو اتنا زچ کرتے ہیں۔ کہ جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ پر زور سے ایک چانٹا رسید کر کے کہا جائے "آداب عرض، بندہ اب چلتا ہے۔ امید ہے پھر کبھی ملاقات ہو گی۔" کچھ تھوڑی سی بدتہذیبی تو ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ بدتہذیبی دوستوں میں جائز ہے تو جان پہچان کے لوگوں میں کیوں نہ روا رکھی جائے۔

مثال کے طور پر اُس روز کے واقعے کو لیجئے۔ میں انار کلی میں ایک دکان کے باہر کرسی پر بیٹھا کباب کھا رہا تھا۔ کہ جس طرح شریف ہندوستانیوں کا پرانا دستور ہے، اور گو کبھی کبھی بازار میں سے تیز تیز موٹروں کے گزر جانے سے حلق میں تھوڑی سی اُڑتی ہوئی مٹی بھی پہنچ جاتی تھی۔ مگر اس کا کیا ہے اگر ہم اپنی پرانی وضعداری نہ نبھائینگے تو اور کون نبھائیگا۔ انگریزوں کو دیکھئے کیا انہوں نے کبھی گرمیوں میں ہماری ڈھیلی ڈھالی شلوار، دھوتیاں اور لمبے لمبے پتلے پتلے ململ کے کرتے پہنے ہیں؟ اگر نہیں تو ہم کیوں بازار میں بیٹھ کر کباب اور چاپیں نہ کھائیں؟ کیوں؟

معاف کرنا مجھے کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گیا، دراصل بات یہ ہے کہ میری طبیعت میں غصّہ بہت ہے، کچھ تو کباب سر دتھے پھر بازار میں اُڑتی ہوئی گرد اور میں ابھی پوری طرح اپنی قسمت پہ غور و خوض بھی نہ کرنے پایا تھا کہ مسٹر روی دت آن دھمکے وہ سامنے سے دانت نکالے چلے آرہے تھے اور میں کباب کھا رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تو بھاگ نہ سکا اور انہوں نے آکر مجھے شانوں سے پکڑ لیا۔ اور مجھے اچھی طرح سے جھنجھوڑتے ہوئے بولے "ہیلو! ہیلو"

اس کے بعد پھر آپ ہی آپ ہنسنے لگے ہی ہی ہی۔

اب بھلا یہ ہنسی کس بات پر تھی۔ میں نے کہا اچھے تو ہیں آپ یعنی میرا مطلب یہ تھا کہ خدا اگر تمہیں غارت کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا" ان جان پہچان کے لوگوں کی ایک بہت بڑی نفسیاتی خصوصیت یہ ہے کہ جب ملتے ہیں۔ تو نہایت تپاک سے اور اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ اگر تم ان کے سگے بھائی نہیں ہو تو بھلا چچازاد بھائی سے کیا کم ہوگے۔ اتنی خوشی، اتنی دلی مسرت، اتنی الفت کا اظہار کرتے ہیں کہ تمہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اگر یہ کمبخت آج مر گیا تو کم از کم آدھی جائداد ضرور ہمارے نام لکھ جائے گا۔

چنانچہ میں نے روی دت کو کہا "کباب کھائیے"

نو ــــ نو ــــ تھینک یو ــــ تھینک یو ــــ

یہ کہہ کر آپ ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گئے اور کباب اٹھا نے

شروع کر دیئے۔ کباب کھاتے کھاتے بہکنے لگے، یار تمہیں مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے کتنی مسرت، اے یار کیا بتاؤں کتنی مدّت کے بعد ملے ہو، میاں تین کباب اور دینا ذرا گرم ہوں۔

یار، مجھے اپنے دل میں انتہائی ندامت محسوس ہوئی، یہ بیوقوف کا بچہ بھی خبیث لاٹوڈی مجھے اپنا دوست کہتا ہے، درحالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بی۔ اے میں میرا ہم جماعت تھا اور بس۔ نہ سلام، نہ دعا میں صرف اس کی شکل ہی سے اسے پہچانتا تھا۔ ورنہ بی۔ اے میں تو میں نے کبھی ان تپ دق کے مریضوں سے واسطہ نہیں رکھا۔ کاش نہ میں سڑک پہ بیٹھ کر کباب کھاتا نہ اس حالت کو پہنچتا۔

"دو کباب اور دینا" ــــــــ روی دت نے کہا، یار کیا بتاؤں تمہیں مل کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، بھلا کتنے سال ہو گئے ہیں تمہیں ملے ہوئے تین کہ چار؟"

میں نے دل میں کہا اے خدا، یا تو بی۔ اے میں اس کی شکل تو نے دکھائی تھی یا آج پھر تو یہ منحوس صورت میرے سامنے لایا ہے۔ تیرے بھید کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے روی دت سے مسکرا کر کہا "غالباً چار سال بی۔ اے پاس کرنے کے بعد۔"

"ہاں ٹھیک یاد آیا، چار، پورے چار" روی دت نے جواب دیا۔ "چار۔ چار کباب دینا ذرا گرم ہوں۔"

یہ تو ایک معمولی سی مثال ہے ورنہ زکام اور جان پہچان کے لوگ یہی تو وہ بیماریاں ہیں جن کا حکمی علاج آج تک کسی ڈاکٹر یا حکیم نے معلوم نہیں کیا۔ اس موقعہ پر مجھے بکرم سنگھ یاد آتا ہے کمبخت امجد نے ایک دفعہ غلطی سے میرا اور اس کا تعارف کرا دیا تھا۔ اب اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک ہی شہر میں رہنے کا بہت بڑا نقص یہ ہے کہ میری اور بکرم سنگھ کی ملاقات کسی گلی کے موڑ پر، کسی بازار کے نکڑ پر، کسی سنیما کے دروازے پر ہو ہی جاتی ہے، مصافحہ ہونے کے بعد ہر دفعہ بالکل یہی مکالمہ ہوتا ہے۔

"اخاہ آپ ہیں"۔

"او ہو، کہیے کدھر تشریف لے جا رہے ہیں"؟

"کبھی ملئے تو سہی"!

"گاہے گاہے تو نیاز حاصل ہوتا رہتا ہے"!

"ہی! ہی! ہی"!

"ہا! ہا! ہا"!

"اچھا! شکریہ"!

"شکریہ"!

چلے جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ آخر انسان اس قدر بیوقوف کیوں ہیں، کہ تھیٹر سینما وغیرہ دیکھتے ہیں، یہاں تو اس دنیا کی سٹیج پر ہر کوئی شکسپیئر

اور آغا حشر ہے،

کبھی کسی سنیما کے دروازے پر ایک صاحب

"ہیلو، ہیلو"

"ہیلو، ہیلو"

کیا آپ لاہور ہی میں ہیں (گویا یقین نہیں آتا) میں سمجھا تھا (دیدہ دانستہ اس کا سا ایکٹنگ کرکے) کہ آپ کہیں لاہور سے باہر چلے گئے ہیں (اب کوئی ان سے کیسے پوچھے کیوں بھئی یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں لاہور سے باہر چلا گیا تھا) آپ بی اے میں پڑھتے ہیں نا! (آج سے دو سال پہلے اسی سنیما کے دروازے پر ملے تھے اور بالکل یہی گفتگو ہوئی تھی) بڑی مشکل سے ضبط کرکے جواب دیتا ہوں،

نہیں جی میں نے تو بی اے دو سال ہوئے پاس کر لیا تھا۔ آج کل منٹو پارک میں گنڈیریاں بیچتا ہوں۔

"اوہ ٹھیک یاد آیا، معاف کرنا —— اوہ —— اچھا پھر ملاقات ہوگی، میں آج کل جنگڑ محلے رہتا ہوں، کبھی آئیے ناصفا چیٹ لانڈری کے قریب"

چلے جاتے ہیں۔

میری جان پہچان کے ایک اور بھلے مانس ہیں۔ اُن کی اور میری واقفیت صرف دو فقروں تک محدود ہے۔ ان سے ملاقات گو بہت مختصر ہوتی ہے۔ مگر نہایت مہذبانہ طریق پر ہوتی جاتی ہے۔ پہلے تو دور سے مسکرانا شروع کر دیتے ہیں

جس کے جواب میں مجھے مسکرانا پڑتا ہے، میں یہ بات آجتک نہیں سمجھ سکا۔ کہ وہ مسکراتے کیوں ہیں، قریب آکر ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرتے ہیں۔ پھر

"مزاج مبارک"

"مزاج مبارک"

اس کے بعد چند ثانئے پھر مسکراتے ہیں۔ اور پھر

"آپ ایم اے میں پڑھتے ہیں نا؟"

"جی ہاں"

مسکراتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ برسوں سے ملاقات ہے کبھی اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے تو سودائی معلوم ہوتے ہیں۔

کہاں تک گنواؤں، میرے ہوسٹل میں ساتھ کے کمرے میں ایک بابو جی رہتے تھے۔ ان سے واقفیت صرف اتنی تھی کہ وہ کبھی مجھ سے بلیڈ ادھارے لیا کرتے تھے۔ اور میں کبھی ان سے فونٹین پن کی سیاہی مانگ لیا کرتا تھا، اس کے علاوہ اُن کا ایک قریبی رشتہ دار تھا جو ایف اے میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا، بس میری تو شامت آگئی۔ میں ذرا کمزور طبیعت کا آدمی ہوں۔ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتا۔ پانچ سال بورڈنگ کی روٹیاں کھا کر آخر میرے دماغ نے عدم تشدد کے فلسفے کو قبول کر لیا ہے۔ اب مجھ میں یہ جرأت ہی نہیں کہ انہیں کہہ سکوں:

بھائی جان آپ کیوں مفت میں میرا مغز چاٹ رہے ہیں، خدا کے لئے کمرے سے باہر تشریف لے جائیے۔ پھر ہماری طبیعتوں میں سرے سے مطابقت نہیں ہے، میں سنیما پسند کرتا ہوں تو وہ تھیٹر کے دلدادہ ہیں۔ میں انگریزی ادب کا عاشق ہوں۔ تو وہ ریاضی پر جان چھڑکتے ہیں، میں سیر کرنا ہنر سمجھتا ہوں تو وہ سرسوں کے تیل کی مالش ۔ لے دے کے بس ایک وہی ان کا رشتہ دار ہے جو کبھی میرا ہم جماعت تھا، بس اُسی کے متعلق گفتگو ہو گی۔ گویا جہان بھر میں مجھے اور کسی کے ساتھ دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی

آخر ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ انہیں تار آگیا کہ وہ ہمارا باہمی دوست چل بسا، سچ جانئے میں تو بہت خوش ہوا کہ چلو خلاصی ہوئی۔ مجھے اور مرنے والے کو بھی اس روحانی کوفت سے نجات ملی، چند روز آرام سے کٹے، چند روز اس لئے کہ یہ صاحب تعزیت کرنے کے لئے مرحوم کے گھر تشریف لے گئے۔ مگر واپس آتے ہی پھر وہی بک بک جھک جھک۔

"اجی وہ آپ کو بہت یاد کرتا تھا، اپنے سب دوستوں کو..... یاد کرتا تھا۔ بڑا نیک آدمی تھا" مرنے والے غریبوں پر بہت سی تہمتیں تراشی جاتی ہیں، ان صاحب نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

"جب وہ مرا ——

"اُس نے اپنے سب دوستوں کو یاد کیا (چاہے بیچارے کو ہچکی لینے کا بھی موقعہ نہ ملا ہو اور وہ اختلاج قلب ہی سے چل بسا ہو)

(۲) اجی مرنے کے بعد اُس کی صورت بالکل نہیں بگڑی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو رہا ہے، آنکھیں ذرا ذرا سی کھلی تھیں۔

(۳) اجی اسے اپنے مرنے کا پتہ تھا۔ چھ مہینے پیشتر ہی سے وہ اُداس سا رہتا تھا نہ کسی کے ساتھ بولنا، نہ کھیلنا، نہ ہنسنا، جیسے موت سامنے کھڑی ہو، اُف، آخری بار جب وہ مجھے ملا، پچھلے سال کی بات ہے وہ مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا، یکایک اس نے مجھ سے پوچھا، کیوں بھئی رفیق کیا بجا ہو گا، میں نے کہا ساڑھے آٹھ، کہنے لگا ساڑھے آٹھ، اُف ساڑھے آٹھ، گاڑی ابھی تک نہیں آئی، اچھا مجھے اجازت دو میں چلتا ہوں، دفتر جانا ہے، یہ کہہ کر وہ چلا گیا، اس کے چہرے پر ایک عجیب اُداسی تھی۔ اتنا کہہ کر آپ چپ ہو گئے۔

میں نے تنگ آکر پوچھا "مگر اس کا اس کے مرنے سے کیا تعلق؟"

"تعلق" آپ نے حیران ہو کر کہا "صاحب تعلق یہ ہے کہ اس واقعہ کے دوسرے سال اُسی دن عین ساڑھے گیارہ بجے مر گیا، ذرا خیال تو کیجئے، پورے ایک سال بعد اُسی دن اور ساڑھے آٹھ بجے کے پورے تین گھنٹے بعد، اب دیکھئے اس دن ساڑھے آٹھ بجے آٹھ بجنے کے چند منٹ بعد ہی گاڑی آگئی اور اُس نے ساڑھے گیارہ بجے مجھے لاہور پہنچا دیا، کتنی حیرت کی بات ہے۔

میں نے بالکل زچ ہو کر کہا، "خدا کے لئے اس بکواس کو بند کرو، اور آئندہ کبھی اس کمرے کا رُخ نہ کرنا، ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔"

یہ جان پہچان کے لوگ کسی غریب کی لاش کو خراب کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آدمی کسی سے "جان پہچان" نہ رکھے، چند دوست بنائے اور بہت سے دشمن، ترقی کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی حربہ نہیں

اتنا لکھ چکنے کے بعد دل میں خیال آتا ہے، کہ آخر میرے بھی بہت سے ایسے احباب ہوں گے جو مجھے فقط اپنی جان پہچان کے لوگوں کے زمرے میں شمار کرتے ہوں گے، اُف کتنی بھول ہوئی۔ اچھا تو جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے واپس لیتا ہوں!

غزلیات

شیرازہ ۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے
کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس
کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک،
گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف
النوع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں
صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی

لئے بہت سی وجہیں ہیں۔ اُنہیں بہ تفصیل بیان کردینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانہ میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی، نہانا ایک انفرادی فعل ہے، اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبولِ عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے۔ ورنہ شائستہ و مہذّب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربیئے کا دوسرے پوربیئے سے کہنا "ارے یار، تونے تو لٹیا ہی ڈبو دی" ذرا خیال کیجئے کتنا نیم غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے، خودداری بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کئے بجے نہاتا ہے تو میں بہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اُسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ——

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟ —— پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پہ پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے —— ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے —— پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

دس بجے ——— صاحب بہادر لیڈر

بارہ بجے ——— منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھینگے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے، اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے۔ تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کرکے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو اُس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کرینگے کہ بھئی آج ہم نہائے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سواراج حاصل ہوگا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جبکہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائیگی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آجکل بعض راسخ الاعتقاد ہندو، سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا مُنہ دیکھ لیتے ہیں بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کرینگے آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو، آجکل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے مگر ہمارے

داداجان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ، واہ اُس نہانے میں بھی کیا مزہ ہوگا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پُرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں۔ بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا، میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض وغایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہیئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرنا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ اُن کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انہیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اٹھ کر

اپنے بھوپنس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا، کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الہیٰ اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؛

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل میں کڑھتا رہتا کہ ہو نہ ہو میرے اُس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھّی ہے، اگر "وہ" مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھّا ہوتا۔"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً مروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں۔ جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال اُبھارا کہ اُسے ضرور نہانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے دریا پر گئی اور نہا کر واپس گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اُس کے چہرے پر

ایک عجیب چمک تھی، اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اُسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے، آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنیگی، اسے میں لونگا، اسے میں لونگا، گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپّا تک پہنچی، طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے، اور بیویاں بیوائیں بن گئیں، اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں "اسے میں نہ دونگا، اسے میں نہ دونگا، یہ میری ہے، یہ میری ہے!"

نتیجہ:۔ نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کرینگے، یہ تو سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے ملیا میٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا، اس کے خلاف پُر زور پروپگنڈا کیا جانا چاہئے مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں، آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے، بغیر پروگرام کے آجکل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اُسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۱۴۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کئے جائیں :۔

"ہرگاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ ...... جو غریب شخص بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا۔ اُسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائیگا ــــ

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا، کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "بابوجی! غسل خانے میں پانی دیر سے دھرا ہے، آپ جلدی نہالیں، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائیگا" میں قلم چھوڑ، میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگ گیا۔

جو نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

بدصورتی

ہمایوں مئی ۱۹۳۸ء عیسوی

اسے میری بد ذوقی سمجھئے یا عامیانہ روش سے بچ کر چلنے کی عادت، بہرصورت
یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بدصورتی کو ہمیشہ خوبصورتی پر ترجیح دیتا ہوں، خوبصورت
چیزیں دیکھ کر میں ہمیشہ اپنے دل میں یہ سوچتا ہوں کہ خوبصورتی تو ایک عارضی شئے
ہے، شفق کی طرح جلد مٹ جانے والی، قوس قزح کی طرح گم ہو جانے والی، لیکن
وہ چیز جو ہمیشہ قائم رہتی ہے، وہ جس پر ہمارے حسیات بھروسا کر سکتے ہیں، جس کے
متعلق کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے

بدصورتی، اور اس دنیا میں تو ہر شے چاہے اُس کی ابتدائی صورت کتنی ہی روشن اور دلپذیر کیوں نہ ہو اپنے انجام کو پہنچ کر بالضرور بدصُورت بن جاتی ہے، پھُول مرجھا جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں، شفق رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے ــــ لیکن بدصورتی ہمیشہ قائم رہتی ہے، شروع سے لے کر آخر تک۔ تو پھر کیوں اُن چیزوں کی طرف توجہ دی جائے، جو عارضی ہیں، وقتی اور ناپائدار، اور بشر اپنے دل کو اُن چیزوں کی طرف کیوں نہ مائل کرے جن کی حیثیت ابدی و دوامی ہے، جو کبھی بدل نہیں سکتی، جن کی ہیئت میں کبھی انقلاب نہیں آسکتا، جو قدرت کے قانون کی طرح اٹل ہیں۔

بدصورتی کے متعلق میرے خیالات کسی صوفیانہ لغزش کا نتیجہ نہیں، ان کی اساس خالصتہً فلسفیانہ ہے۔ اسے مذہب، آرٹ اور اس قسم کی دیگر باتوں سے کوئی تعلق نہیں، خوبصورتی کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک اعتباری اصلاح ہے جس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی، یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ فلاں چیز حسین ہے، لیکن کسی بدصورت چیز کے متعلق ہر وقت اور ہر لمحہ نہایت وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بدصورت ہے۔ اور یہی بدصورتی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ علاوہ ازیں بدصورتی زندگی اور کائنات کا جزو لاینفک ہے، اس کے بغیر خوبصورتی ایک لمحہ نہیں جی سکتی حسُن کی بنیادیں بدصورتی پر استوار ہوتی ہیں، اور اس لحاظ سے بدصورتی بھی ایک طرح کا حسُن ہی ہے۔ آئن سٹائین کے اضافی نظریہ سے اس خیال کو تقویت

پہنچی ہے، اور شاید اسی نظریہ کے ماتحت ہمیشہ دُنیا میں سُکھ کے ساتھ دُکھ، پھولوں کے ساتھ کانٹے اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ بدصورت مرد رہتے ہیں۔

روحانی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں اصلی حُسن صرف بدصورتی میں ہے۔ مثال کے طور پر آپ دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صُورتوں کی طرف توجہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ صرف بدصورت آدمی ہی دنیا کے "بڑے آدمی" بنتے ہیں بیچارے خوبصورت آدمی تو عام طور پر فوج میں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور بدصورت آدمی اُن پر حکومت کرتے ہیں، دُور کیوں جائیے ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں کی صورتیں ملاحظہ کیجئے، سوائے چند مستثنیات کے باقی سب وہ ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ میں یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ بڑائی صرف بدصُورت آدمیوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے، چنانچہ اس بیسویں صدی میں جب مردوں اور عورتوں کو حسین بنانے کے لئے سینکڑوں طریقے برتے جا رہے ہیں، میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے رہنما، بڑے بڑے امیر، فوج کے جرنیل، ادیب، فلسفی، سائنسدان بے حد بدصورت واقع ہوئے ہیں۔

دراصل مجھے بدصورتی سے ایک گونہ عشق سا ہو گیا ہے، لوگ تو خوبصورت عورتوں پر مرتے ہیں، میں بدصورت عورتوں کو دیکھ کر جلتا ہوں اور جب کبھی

میرے گھر میں میرے بیاہ کے متعلق کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے تو میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں اور اکثر نوجوانوں کی طرح جوان موقعوں پر لڑکی کیسی ہے ؛ خوبصورت ہے نا ؛ رنگ کیسا ہے ؛ قد و قامت ؛ اور اس قسم کے سوالوں کا تانتا باندھ دیا کرتے ہیں، میں بھی اول جلول بکنے لگ جاتا ہوں، مثلاً

"لڑکی بدصورت ہے نا ؟"

"ہاں"

لیکن محض " ہاں " سے میری تسلی نہیں ہوتی، چنانچہ میں پھر سوال کرتا ہوں۔

"کیا اُس کی جلد بالکل سیاہ ہے، سیاہ جیسے اماوس کی رات

"ہاں، ہاں، اطمینان رکھو"

"اور دانت ؟"

"میلے اور سُرخ! شاید پان بہت کھاتی ہیں"

"بہت خوب، ...... اچھا! ...... مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں ؟"

"آنکھیں ؟ آنکھیں تو ذرا بڑی بڑی سی ہیں، چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بال بھی تو گھنگھریالے ہیں ..."

"چچ ...... چ ...... چ ...... میں ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہوں " یہ تو بہت بُری بات ہے "

اور اس طرح یہ ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اسی طرح کئی ناطے آئے، مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص موجود تھا، کسی کا رنگ کھلتا ہوا تھا، تو کسی کی ناک ستواں، کسی کی کمر پتلی تھی، تو کوئی سرو قد، غنچۂ اُمید کھلا پر نہ کھلا اور گو اب میری عمر تیس سے کچھ اُوپر ہے، مگر پھر بھی پُر اُمید ہوں اور ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جو کامل بدصورت ہو....... ایک بار...... منٹو پارک لاہور کی نمائش میں ایک ایسی عورت دیکھی تھی جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ "وہ ہے میرے خوابوں کی محبوبہ"! لیکن افسوس کہ وہ بھی کسی کی بیاہتا نکلی!

بدصورتی کے خلاف اگر کوئی دلیل دی جا سکتی ہے تو وہ ہے شاعروں کی شاعری شاعر لوگ شعر کہتے ہیں تو صرف حسین چیزوں کی تعریف میں حسین عورتیں، حسین پھول، حسین وادیاں، بس یہی ان کے موضوع ہیں۔ کیا کبھی کسی شاعر نے مگرمچھ کی شان میں بھی طبع آزمائی کی؟ کسی بدصورت عورت کو دیکھ کر کبھی کسی شاعر کے شاعرانہ جذبات کو تحریک ہوئی؟ اگر نہیں تو بس پھر بدصورتی ایک بیکار شئے ہے۔ کچھ اس قسم کے دلائل بدصورتی کے خلاف شاعر مزاج لوگوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، لیکن ان دلائل پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ شاعر لوگوں سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کبھی سطحی اور جذباتی حرکتوں سے بے نیاز ہو کر اس اہم سوال کے حسن و قبح پر غور کر سکیں، اس کے علاوہ وہ تو محض خوبصورتی کے گن گانے کے سبب کماکھاتے ہیں، اگر آج لوگ بدصورتی کی اہمیت سمجھ جائیں تو یہی شاعر لوگ جو آج بلبلوں اور

گلاب کے پھولوں پر جان چھڑکتے ہیں، کل کو بے اور بھنگ کی کونپلوں پہ طبع آزمائی کرنا شروع کر دیں، ضرورت یہ ہے کہ پہلے آپ لوگوں کی ذہنیت میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو لیکن میں اس پر بھی شاعروں کا اعتبار نہیں کرونگا۔ کیونکہ شعر کہنا بذاتِ خود ایک خوبصورتی ہے، اور خوبصورتی کا اعتبار کیا؛ خود شاعروں نے اپنے لاکھوں شعروں میں حسن کی بیوفائی اور خوبصورتی کی بے ثباتی کا رونا رویا ہے پھر یہ لوگ کسطرح بدصورتی کیخلاف کچھ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں

خوبصورتی فساد کی جڑ ہے، پتھر اور دھات کے زمانے سے لیکر آجتک خوبصورتی دُنیا کے امن کو تباہ و برباد کرتی چلی آئی ہے خوبصورت چیزوں کے حصول کیلئے لوگوں نے اپنی جانیں گنوا دیں تہذیبیں مٹ گئیں، اور قومیں فنا ہو گئیں، لیکن ہم ہیں کہ اُسی جنون خیز دیوانگی سے پرانے راستے پر لڑھکے جا رہے ہیں، خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی، اس دیوانگی کے جوش میں ہم نہیں سمجھتے کہ امن عالم کیوں خطرہ میں ہے، وہ کیا چیز ہے جو اقوام عالم میں اتحاد نہیں ہونے دیتی، لوگ کیوں لڑتے ہیں؟...... اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں تنازعے محض خوبصورتی ہے لوگ لڑتے ہیں خوبصورت چیزوں کیلئے، خوبصورت خیالوں کیلئے، خوبصورت عورتوں کیلئے، خوبصورت خطوں کیلئے، خوبصورت ملکوں کیلئے، اگر لوگ آج بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں تو امن قائم ہو سکتا ہے، گذشتہ دس بارہ ہزار سال کی انسانی زندگی میں خوبصورتی نے ہم پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں تاریخ کے اوراق اُس پر گواہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے، کہ ہم لوگ خوبصورتی کے مضر خواص سے واقف ہو جائیں، اور خوبصورت چیزوں کیلئے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں یہ فضول باتیں ہیں، آخر ہماری انسانی زندگی کی ساخت بڑی بڑی چیزوں پر نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بدصورت قسم کی باتوں ہی پر ہے مثلاً روٹی، پانی، کپڑا......

رونا

شیرازہ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ء

مثل مشہور ہے گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ کہنے کو تو سچ ہے لیکن جہانتک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں۔ "ہم" سے میری مراد ساری انسانی برادری ہے"۔ کبھی آپ نے اس حقیقت پہ غور کیا ہے کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ گانا تو خیر کبھی کبھی سُن لیتے ہیں اور اگر کوئی قریب نہ ہو تو گا بھی لیتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنسان سڑک پہ چلتے ہوئے لیکن رونا جو ہمارے بچپن کا ایک

مرغوب ومحبوب مشغلہ ہے۔ اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے۔ ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے کہ آخری بار جب وہ روئے تھے۔ اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔
"اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی۔" پھر میری طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے لگے "آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت ہوتی ہے۔ تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے کبھی کبھی یونہی رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں، لوگ کیا کہیں گے۔"

رونا کیوں اس قدر ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کہ ہر شریف انسان اسے برا سمجھتا ہے۔ اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل ہے، بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی گانا بیشک ایک اچھی چیز ہے لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر بچپن میں ہم گاتے کم تھے۔ اور روتے بہت بچپن میں جب ہم روتے تھے۔ تو اکثر بار بار پچکارنے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے۔ بلکہ کئی لوگ پچکارتے بھی نہ تھے، وہ کہتے تھے، اچھا ہے خوب روؤ۔ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے۔ اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہو جائے۔ تو لوگ اسے بزدل، زنانہ مزاج، پست ہمت کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی بیچارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں۔ یا ایک آدھ ہلکی سی چیخ بھی منہ سے نکل جائے۔ تو اسے ہیجڑا کہہ دینے میں انہیں کوئی تامل نہیں

ہونا، آخر بات کیا ہے؟ ایک چیز جو بچّوں کے لئے مفید ہے۔ اُن آدمیوں کے لئے جو اب بچّے نہیں ہیں کیسے مضر ثابت ہو سکتی ہیں۔

حکیم لوگ بتاتے ہیں، کہ رونا بچّوں کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ اس سے چھاتی کھُلتی ہے۔ پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر آنکھ کی پتلیوں کو صاف کرتے ہیں۔ ناک کے نتھنوں سے ریشہ جاری ہو کر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے۔ رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ الغرض رونا کشتی کرنے کے بعد دوسری بہترین ورزش ہے۔ پھر اس سے محض بچّے ہی کیوں فائدہ اُٹھائیں، سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپھڑوں کی ضرورت نہیں میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت تھی، تو اب جوانی یا بڑھاپے میں تو اس کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے۔ غالباً بچوں کے دن رات رونے کی وجہ ہی سے تپ دق نہیں ہوتا۔ اگر ہم لوگ بھی روزانہ دو تین گھنٹے رو لیا کریں۔ تو جہاں پھیپھڑے مضبوط ہوں وہاں نہ دمہ ہو نہ زکام، آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے کتنے بچّے چشمہ لگاتے ہیں اور کونسا بوڑھا یا جوان ہے جو چشمہ کی کی حاجت نہیں محسوس کرتا۔ لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سدھ مکر دھوج گولڈ پرلز، ماءاللحم شربتِ فولاد استعمال کرتے ہیں، لیکن اگر ان قیمتی دوائیوں کے بجائے وہ قدرت کے بیش بہا اصول برتیں۔ اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں۔ تو جہاں جسم طاقت ور رہے، وہاں دن بھر دل میں امن و سکون

بھی رہے۔اور وہ انتشار جو اس بیسویں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے۔
خود بخود مٹ جائے۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لئے کس قدر مفید ہے۔رونا جسم کی
غذا ہے۔نہ صرف جسم کی بلکہ روح کی غذا بھی۔ایسی مفید عادت کے لئے اور اسے
بڑے پیمانے پر رائج کرنے کے لئے عالمگیر پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔اس کے
لئے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں۔سکولوں اور کالجوں
میں رونا لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے
آدمی روتے ہوں مثلاً ہٹلر، مسولینی، چیانگ کیشک، بڑے بڑے آدمیوں کو اس
طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ کر عوام پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔اور وہ بھی بے
اختیار رونے لگ جائیں گے۔ذرا تصور کیجئے ایک بڑا سا سینما ہال ہے جہاں
ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے زور زور سے رو رہے ہیں، کتنا خوبصورت منظر ہے۔کیا
یہ آپ کے شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا؟ یا پھر ہاکی، کشتی، فٹ بال کی طرح
رونا بھی بطور ایک ورزش کے سکھایا جائے۔ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں کے
قریب میدانوں میں لاکھوں آدمی کھڑے کئے جائیں جو چیخیں مار مار کر روئیں اور اپنی صحت
کو بہتر بنا لیں۔اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں۔ملکۂ موسیقی
کی طرح ملکۂ گریہ، "رونے کا بادشاہ" وغیرہ وغیرہ۔اس پروگرام کو مقبول عام بنانے
کے لئے سینکڑوں طریقے برتے جا سکتے ہیں۔صرف نمونہ کے لئے چند ایک یہاں

درج کئے ہیں۔ تاکہ سند رہے۔ باقی طریقوں کے لئے ڈیڑھ روپیہ کے ٹکٹ بھیجکر الراقم سے خط و کتابت کریں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں، بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں لیکن بعض بچے بہت بہادر اور دلیر ہوتے ہیں، وہ اکثر گھنٹوں کیا کئی کئی دن روتے رہتے ہیں کھانا بھی کھاتے ہیں، کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لے کر لگاتار روتے رہتے ہیں، میں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر یہ کیا نہ کرسکیں گے، یوں بھی تو بذاتِ خود یہ کوئی کم کارنامہ Achievement نہیں۔ اور میں تو اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی کہ واٹرلو کی لڑائی، فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملہ کو دی جا سکتی ہے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے۔ جیسے برسات کی بارش، ذرا اُستاد نے دو چار بید لگا دیئے۔ تو رو رو کر جھڑی لگا دی۔ ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا، اُدھر تبسم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش پل میں دھوپ۔ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے۔ لڑکپن میں ہر کام ایسا ہوتا ہے۔ عجلت پسندی اور غیر مستحکم ارادوں کی، بس ان کا نام لڑکپن ہے اور شباب تو اس سے بھی بُرا ہے۔ اوّل تو جوان ہو کر لوگ روتے ہی نہیں۔ اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس جگہ جہاں نہ کوئی دیکھ پائے نہ سُن سکے جیسے کسی گناہِ قبیحہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یونہی کبھی کبھی رسماً آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی چیخ۔ لیکن شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی لوگ روتے ہیں مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے۔ کہ ہُو ہُو ہُو کرکے لبوں پر جھاگ لا کر آنسوؤں سے سفید سفید داڑھی کو تر کر لیا جائے، یہ رونا نہیں بلکہ رونے کی ہنسی اُڑانا ہے۔ دراصل داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اور یوں بھی تو اس میں بوڑھوں کا کیا قصور ہے۔ دراصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں۔ رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر رونا انہوں نے بطور فن یا ورزش کے سیکھا ہوتا۔ تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

رونا ایک فن ہے، رونا ایک ورزش ہے، رونا ایک آرٹ ہے۔ مؤخر الذکر کو بچوں اور عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے۔ میں نے وہ بچے دیکھے ہیں جو اس طرح سسکیاں بھر بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ دل میں ترحم اور ہمدردی کا جذبہ عمیق موجزن ہو جاتا ہے۔ اور وہ انہیں بازوؤں میں اُٹھا کر پچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور عورتیں؟ ــــ رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے۔ عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں کی تواریخ میں انقلاب پیدا کر دئے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن، ایک مسز سمپسن، آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک ملتجی نگاہ اور شاید آج دنیا کی تواریخ مختلف ہوتی۔ اگر تاریخ کے ہر صفحے پر کسی عورت کے دو چار آنسو نہ ٹپکے پڑتے۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں

ہر ساتویں دن ایک معاشرتی انقلاب آجاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کمبخت مرد رونا نہیں جانتے اور عورتیں آنسو بہا کر ہمیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتی ہیں وقت آگیا ہے کہ دنیا کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس دام فریب کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم غریب مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے اٹھو مجاہدو اٹھو سرفروشی کی تمنا۔ وغیرہ وغیرہ یاد رہے کہ ہماری آزادی کی بہتر صورت رونا ہے۔ خوب روؤ جی بھر کر روؤ۔ دن میں بار بار روؤ۔ اگر عورت کے چند آنسو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے۔

بیچلر آف آرٹس

شیراز ۸ اگست ۱۹۳۸ء

بیچلر آف آرٹس: کتنا شاندار نام ہے۔ سنتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے
کسی انگریزی مٹھائی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ یا کوئی اعلیٰ اعزازی خطاب۔ "رائے
صاحب" اور "خان صاحب" تو اس کے سامنے بالکل بے جان اور ہیچ معلوم ہوتے
ہیں "بیچلر آف آرٹس!" انہیں ادا کرتے وقت زبان بھی چٹخارے لیتی ہوئی معلوم
ہوتی ہے۔ کتنے شاندار الفاظ ہیں ہیبت اور جلال سے معمور! ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ یہ کسی عظیم الشان عمارت کا نام ہے۔ ایسی عمارت جو تاج محل کی طرح خوبصورت

اور قطب صاحب کی لاٹ کی طرح مضبوط اور بلند!

لیکن دراصل بیچلر آف آرٹس نہ تو کوئی انگریزی مٹھائی ہے۔ نہ ہی کوئی اعزازی خطاب یا کوئی خوبصورت عمارت بلکہ یہ تو ایک غریب یتیم سی ڈگری کا پورا انگریزی نام ہے۔ جسے عرف عام میں "بی۔ اے" کہتے ہیں۔ شائد آپ میری بات ماننے سے انکار کریں اور غصہ میں آکر کہیں۔ اجی صاحب! یہ آپ کیا کہتے ہیں کہاں بیچلر آف آرٹس جیسا حسین و قبول صورت نام، کہاں بیچارا غریب بی۔ اے ان دونوں میں کیا خاک مطابقت ہو سکتی ہے۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی اونہہ!

لیکن یہ ہے درست۔ بیچلر آف آرٹس ہی بی اے کا پورا نام ہے۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے، کیا آپ اپنے گھر کے بہشتی فیض احمد خاں کو "پھجا" کہہ کر نہیں پکارتے۔ دفتر کے چپراسی منگل سنگھ کو "منگو" چندر روشن کو "چندرو" پھر اگر زمانے کے چکر سے بیچلر آف آرٹس سمٹ کر اور سکڑ کر صرف بی۔ اے رہ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ غربت میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

لیکن ایک زمانہ تھا کہ جب بی۔ اے کی معنوی حالت ایسی نہ تھی جیسی اب ہے یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب ابھی ہم میں سے بہت سے نوجوان پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ اور غالباً مرحوم شاہ جارج پنجم کی ابھی دہلی میں تاج پوشی بھی نہ ہوئی تھی۔ تو ان دنوں سنا ہے کہ بی۔ اے کی ڈگری کا بہت رعب تھا۔ ہمارے محلہ میں

ایک بوڑھے ڈپٹی صاحب رہتے ہیں۔ بڑے بھلے مانس ہیں متین صورت، سفید ریش اور آنریری مجسٹریٹ۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کہنے لگے میاں صاحب زادے میں دیکھتا ہوں۔ تم آج کل اداس سے رہتے ہو! اور اکثر آوارہ پھرتے رہتے ہو۔ لیکن جب ہم تمہاری عمر کے تھے۔ تو بی۔ اے پاس کر کے فوراً تحصیلدار بن گئے تھے۔ ان دنوں ہمارے بتاجی گلیوں میں آلو چھولے گرما گرم بیچا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنا اور گاہکوں کا پیٹ کاٹ کر پڑھایا! اور ایک تم ہو کہ بی۔ اے پاس ہو۔ ملازمت ابھی تک کہیں ملی نہیں اور ہر وقت ہیٹ بوٹ سوٹ ڈانٹے رکھتے ہو۔ اس طرح پندرہ بیس منٹ وہ لمبا چوڑا وعظ سناتے رہے۔ اور جب چپ ہوئے تو میں نے نہایت نرمی سے اور برخوردانہ انداز میں سر جھکا کر کہا حضور آپ نے کس سن میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے آنکھیں بند کر کے اور حافظے پر زور دے کر کوئی سال بتایا۔ وہ سن اب مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں اٹھارہ ہو گیا! لیکن بہر حال وہ سن قبل از مسیح نہیں تھا۔

اور اس طرح کی رومانی داستانیں غالباً آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ ایک رنگریز کا بیٹا جو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وظیفہ پر ولایت بھیج دیا گیا۔ اور وہاں سے واپس آنے پر فوراً چیف انجینئر بن گیا۔ ایک پٹواری کا صاحب زادہ جو ایک دن اپنے باپ کا حاکم بنا اور جسے انجام کار اپنے باپ ہی کو رشوت ستانی

کے الزام میں ملازمت سے برطرف کرنا پڑا۔ ایک غریب تنبولن کا بچہ جو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آئی سی ایس بنا اور جس کے ڈرائنگ روم میں آج بھی ایک چھوٹا سا چاندی کا کوٹھو بطور یادگار منٹل پیس پر رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک گنڈیریاں بیچنے والے کا لڑکا ایک خانساماں کا نواسا ...... وغیرہ وغیرہ۔ بدلتے زمانے کی عجیب و غریب حکائتیں دلچسپ شبریں اور پر کیف جنہیں پرانے زمانے کے پنشن یافتہ بزرگ یا بڑی بوڑھی خالائیں سردی کے دنوں میں انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر کم عمر اور خام عقل انڈر گریجیٹوں کو سنایا کرتی ہیں۔ میں انہیں "بی۔ اے کی کہانیاں" کہا کرتا ہوں۔ اور یہ بی۔ اے کی کہانیاں اتنی ہی میٹھی اور دل نواز ہوتی ہیں۔ جتنی الف لیلیٰ کی داستانیں اور اتنی ہی حیران کن۔ انہی افسانوں کو سن کر بیچارے غریب انڈر گریجویٹ نئے نئے منصوبے باندھنے لگتے ہیں۔ خوبصورت ہوائی قلعے۔ کبھی عالم خیال میں دیکھتے ہیں کہ وہ ہائی کورٹ کے جسٹس کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ارد گرد وکلاء اور بیرسٹر "مائی لارڈ"، "مائی لارڈ" کہہ کر کورنش بجا لا رہے ہیں یا وہ کپتان پولیس بن گئے ہیں۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر بازار سے گزر رہے ہیں۔ ان کی دستار کا سفید طرہ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ اور لوگ اس سفید پرچم کو جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں۔ یا پھر وہ آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں چوتھے نمبر پر آئے ہیں۔ والد کو اتنی خوشی ہوتی ہے کہ انہوں نے شہر کے سارے بینڈ اپنے گھر کے دروازے پر اکٹھے کر لئے ہیں۔ ....

مگر نہیں یہ سب دھوکا ہے۔ دھوکا اور مایا!

یہ کچھ تو ان بی اے کی سنی سنائی کہانیوں کا اثر ہوتا ہے اور کچھ جوانی کی اُبلتی ہوئی مستی کا کہ بی۔اے پاس کر لینے کے بعد کچھ عرصہ تک ایک نوجوان کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری رہتا ہے۔ اور اپنے تئیں ایک بہت بڑا انسان سمجھتا ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ میں بی۔اے کے امتحان کی اہمیت واٹرلو کی لڑائی، سکندر کے حملے اور ماؤنٹ ایورسٹ کی مہم سے کم نہیں ہوتی۔ وہ جب گھر والوں سے بات کرتا ہے تو اس طرح ایک باوقار مہذب مجلسی طریق پر گویا وہ خود اپنے ہی گھر میں ایک مہمان ہے۔ آدابِ نشست و برخاست میں اس کی کیفیت اور بھی مضحکہ خیز ہوتی ہے مثلاً جب کرسی پر بیٹھتا ہے۔ تو اس طرح محتاط اور چوکنا ہو کر گویا وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے اور اسے ہر لحظہ وہاں سے گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس کی چھاتی اور گردن کا تناؤ ان دنوں اتنا شدید ہوتا ہے۔ کہ بیچاری ماں اسے بار بار پوچھ لیتی ہے کیوں بیٹا وحید تمہاری گردن کو کیا ہوا ہے۔ کہیں کوئی بل تو نہیں پڑا۔ لاؤ ذرا مالش کر دوں جس سے بیٹا وحید اور بھی چڑ جاتا ہے اور جب وحید بازار میں نکلتا ہے۔ تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کے جسم کے رونئیں رونئیں پر "بی اے" لکھا ہے۔ اور لوگ اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں۔ لو دیکھو وہ جا رہا ہے۔ عالی ہمت نوجوان جس نے اس سال بی اے پاس کیا ہے۔

لیکن یہ ہذیانی کیفیت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ اور اس امر کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ کاش آپ اس روز یونیورسٹی کے ہال کے دروازے پر کھڑے ہوتے کہ جس روز میں وہاں سے سیاہ گون میں ملبوس۔ آنکھوں پر چشمہ لگائے۔ ہاتھ میں بی اے کی ڈگری لئے خراماں خراماں باہر نکلا۔ دس نومبر ۱۹۳۰ء کی سہانی صبح تھی۔ اور یونیورسٹی ہال کے پرانے کلاک سے لیکر تانگے والے کی آواز تک دنیا کی ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ انارکلی کے دکاندار بھی ہمیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور بے اختیار ہنس رہے تھے۔ ہم لوگ ٹولیاں بنائے ریشمی گونوں کی سرسراہٹ کی موسیقی کو سنتے ہوئے انارکلی بازار میں گئے۔ اور فوٹو کھینچنے والوں کی دکانوں میں گھستے گئے۔ یہاں کتنی بھیڑ تھی۔ کتنا شور و غل۔ ہر طرف سیاہ گون دلچسپ باتیں اور بلند قہقہے۔ پھیری والوں اور مانی ڈیئر کی آوازیں تصویر کھچوائی۔ پھر راستے میں ایک رائٹنگ پیڈ کے لئے بھی آرڈر دیا گیا۔ لالہ بہاری رام بی اے تک الٰہی بخش بی اے، سردار لچھمن سنگھ بی اے غرض نام سے نہیں بلکہ لفظ بی اے کی نمائش سے تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ یہ گھر والوں کے چاؤ چونچلے، دوستوں بزرگوں اور رشتہ داروں کی دلداریاں چند روزہ تھیں۔ چند دنوں تک ہماری ہر طرح دلداریاں ہوتی رہیں۔ فرض کے پردے میں دنیاداریاں ہوتی رہیں۔ اور چند دنوں تک ہم نے بھی یہی سمجھا۔ کہ اب ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم آیا۔ کہ اب آیا کہ سرکار تمہارے بی اے کی ڈگری حاصل کر لینے پر بہت خوش ہے

اور عالی ہمتی کے صلے میں وہ تمہیں تحصیلدار یا ڈپٹی یا پولیس کپتان کا عہدہ سونپتی ہے لیکن جب دن کیا مہینے گزر گئے۔ اور سوائے ایک سائیکل کے چالان کے اور کوئی سرکاری پروانہ نہ آیا۔ تو ہم نے سوچا۔ کہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ کوشش کرنی چاہئے۔ عین ممکن ہے۔ کہ سرکار کو ہمارے بی اے پاس کرنے کا پتہ ہی نہ ہو۔ اتنی بڑی سرکار ہے۔ اور آخر انہیں اور بھی بہت سا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو اسی طرح سوچ سمجھ کر آخر ہم آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ بقول حضرت علامہؒ مرحوم

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہاں بی اے سے بھی اوپر ڈگریاں ہیں۔ اور ان کے مالک بھی یہاں امتحان کے لئے آئے ہوتے ہیں۔ دل میں کچھ مایوسی سی ہوئی۔ اسی تذبذب میں پرچے بھی اچھے نہ ہوئے۔ اور رہی سہی کسر انٹرویو نے پوری کر دی۔ یہ انٹرویو بھی عجیب بلا ہے۔ ہم نے یہ مضمون بی اے میں کاہے کو پڑھا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی۔ کہ میں بطور احتیاط والد صاحب کی سونے کی گھڑی ساتھ لیتا گیا تھا۔ جو انہیں انعام میں ملی تھی۔ ورنہ نہ جانے کیسی زک اٹھانا پڑتی۔ انٹرویو کمیٹی کے صدر بہت مہربان طبیعت کے مالک تھے۔ مجھ سے نہایت نرمی سے کہنے لگے۔ تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنا

نام بتایا۔ تو کمیٹی کے ایک صاحب جھٹ بول اٹھے۔ ڈرتے کیوں ہو کھل کر بات کرو۔
یہاں تمہیں کوئی کھا تو نہیں لے گا۔

میں نے کہا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرا باپ اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔
کمیٹی کے ممبروں نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن مجھ سے کوئی جواب
نہ بن پڑا۔ آخر جب میری خاندانی خدمات کا سوال آیا۔ تو میں نے جھٹ جیب سے گھڑی
نکال کر سامنے رکھ دی۔

یہ کیا ہے ؟ صاحب صدر حیران ہو کر بولے۔

یہ ایک گھڑی ہے۔ میں نے جھٹ جواب دیا۔

ہاں، ہاں۔ یہ تو میں بھی دیکھتا ہوں۔ کہ یہ ایک گھڑی ہے

میں نے مسکرا کر کہا، جناب والا ! یہ گھڑی سونے کی ہے اور میرے والد کو انعام میں ملی ہے،

بہت خوب ! ایک ممبر نے پوچھا۔ کوئی اور خدمات ——

میں نے کہا۔ لڑائی میں میرے دادا کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی۔

اس کا کوئی ثبوت۔ کوئی سرٹیفکیٹ !

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ سرٹیفکیٹ تو کوئی نہیں۔ لیکن دادی
اماں نے مجھ سے یہ بات اکثر بیان کی ہے کہ میرے دادا کے دادا ....

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ہنس پڑے۔ آخر صاحب صدر
نے مجھ سے کہا۔ "you can go now"

میں جیب میں گھڑی ڈال کر باہر نکل آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب آئی سی ایس کا نتیجہ نکلا تو میرا نام بھی موجود تھا۔ لیکن دو سو ننانوے نمبر پر۔

آئی سی ایس کے امتحان کے بعد بیچارا غریب بی اے کئی چکر کاٹتا ہے۔ اور کئی پاپڑ بیلتا ہے۔ کبھی انٹرویو میں فیل کبھی باقی پرچوں میں صفائی۔ فوج اور پولیس میں کوشش کی۔ تو قد چھوٹا نکلا۔ یا اگر قد ٹھیک تھا۔ تو چھاتی چھوٹی نکلی۔ غرضیکہ ہر طبی معائنے پر اس کے جسم میں کوئی نہ کوئی نیا نقص ضرور نکل آتا ہے۔ آئی سی ایس میں اس کی آنکھیں کمزور تھیں۔ پی سی ایس میں اس کے پھیپھڑے مضبوط نہ رہے جب تحصیل داری کے امتحان میں پہنچا۔ تو اسے اختلاج قلب کا دورہ پڑنے لگا۔ اور آخر جب وہ سرکاری کلرکوں کے امتحان میں شریک ہوا۔ تو ڈاکٹروں کی کمیٹی نے بتایا۔ کہ اسے ضعف دماغ کی شکایت ہے اور عین ممکن ہے کہ چند مہینوں میں پاگل ہو جائے۔

ان مرحلوں سے گزر کر اسے پتہ چلتا ہے کہ محض بی اے کی ڈگری کی کتنی اہمیت ہے۔ بی اے کی ڈگری تو ایک نہایت حقیر سی شے ہے۔ یہاں قد چاہیئے۔ جسم اور صحت فوجی اور سول خدمات نشست و برخاست کے صحیح آداب، خاندانی وجاہت دولت اور رئیسانہ اہتمام۔ وہ دن لد گئے۔ کہ جب باپ آلو چھولے بیچتا تھا۔ اور بیٹا بی اے ہو کر جھٹ ڈپٹی بن جاتا تھا۔ اب تو یہ حالت ہے۔ کہ باپ اگر ڈپٹی ہے تو بیٹا آلو چھولے

بیچ رہا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے میرے محلے کے ڈپٹی صاحب پھر مجھ سے ملے۔ ان کے لڑکے نے حال ہی میں بی اے پاس کیا ہے۔ مجھ سے کہنے لگے "میاں تم نے تو بہت سے مقابلے کے امتحان دیکھ لئے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی صلاح دو۔ صاحبزادے کو کہاں بھیجیں؟

میں نے عرض کی قبلہ اسے کسی مقابلے کے امتحان میں مت بھیجئے گا۔

تو پھر کیا کروں۔ ڈپٹی صاحب نے جھلا کر کہا اسے اتنا پڑھایا ہے۔ بی اے ہے

میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ ڈپٹی صاحب! آپ کے سوا خاندان بھر میں اور کسی فرد کی بھی سرکاری خدمات ہیں۔

ڈپٹی صاحب رک رک کر بولے اُں .... نہیں .... تو .... لیکن سنا ہے کہ ہمارے ایک بزرگ نے غدر میں ایک افسر کی جان بچائی تھی .... کچھ ٹھیک طرح .... سے .... یاد نہیں۔ لیکن اگر کوشش کروں تو ....

میں نے کہا "وہی میرے دادا کے دادا کی ٹانگ والا قصہ ہے۔

ڈپٹی صاحب بولے۔ کیا کہا آپ نے؟

میں نے جواب دیا۔ کچھ نہیں۔ میں تو یہی کہتا ہوں۔ کہ اسے مقابلے کے امتحان میں نہ بھیجئے۔ اور آگے پڑھانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ بی اے کی ڈگری محض ایک بے کار سی شے ہے اسے کسی تجارتی کاروبار میں لگائیے۔ جوتوں کی دکان ....

جوتوں کی دکان؟ ڈپٹی صاحب نے غصہ سے کہا۔

پاکوڑیوں کی دکان! میں نے آہستہ سے کہا۔
ڈپٹی صاحب فرش پر تھوکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

تو یہ ہے بی۔اے کی داستان، رنج و عبرت کا مرقع اسے سن کر بی۔اے والوں کی حالت پر چاہے ہنسئے۔ چاہے روئیے۔ لیکن ہنسنے کے وقت یہ یاد رہے کہ بی۔اے مرد بھی ہوتے ہیں۔ اور عورتیں بھی۔ اور آج کل بی۔اے عورتوں کی حالت اتنی ہی ناگفتہ بہ ہے جتنی بی۔اے مردوں کی۔ وہ زیادہ سے زیادہ کسی گرلز سکول میں ملازم ہو جاتی ہیں۔ اور دن بھر لڑکے لڑکیوں کو کھلاتی پڑھاتی رہتی ہیں ننھے ننھے لڑکے، بسورتی ہوئی لڑکیاں اور وہی الف بے تے کی مہارنی۔ بس انہی دھندوں میں پھنس کر بیچلر آف آرٹس ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کو بی۔اے والوں کی حالت پر ہنسی آئے تو یہ امر ذہن میں رکھ لیجئے کہ ان میں بی۔اے عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر تہذیب آپ کو اجازت دے تو شوق سے ہنسئے!

ٹوپ والا

شیرازہ یکم اگست ۱۹۳۷ء

شہروں میں تو ٹوپ والا بابو گلی گلی مارا پھرتا ہے۔ مگر ہندوستان کے دیہات میں ابھی اُسے ایک حد تک وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس تفاوت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دیہات میں خاکی ٹوپ کمیاب ہے۔ شہروں میں تو ٹوپ والے اس کثرت سے ہیں کہ اگر ہاؤس ٹیکس، روڈ ٹیکس، موٹر ٹیکس کے بجائے "ٹوپ ٹیکس" لگا دیا جائے تو کافی آمدنی ہو سکتی ہے اور شہروں کے گندے پانی کے نکاس کا بھی بخوبی انتظام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مکان اور موٹر تو ہر کس و ناکس کے پاس نہیں ہے۔

لیکن خاکی ٹوپ جسے عام اصطلاح میں "سولا" بولتے ہیں آجکل ہر شہری گھسیارے، موچی، طالب علم، بہشتی، آنریری مجسٹریٹ اور لیبر لیڈر کے سر پر چپاں نظر آتی ہے۔ بہر دلعزیزی اس خیال کو تقویت دیتی ہے کہ خالص سودیشی حلقے بھی اس ٹیکس کی مخالفت نہیں کرینگے۔ الغرض یہ تجویز ہر لحاظ سے قابل قبول ہے اس سے نہ صرف خاکی ٹوپیوں کی تجارت کو فائدہ ہوگا بلکہ کئی بیکار نوجوان خودکشی سے بچائے جا سکیں گے۔ اور اکثر اصحاب فخریہ انداز سے یہ کہیں گے "دیکھو بھئی میں پانچ روپے تین آنے ٹوپائی ٹیکس ادا کرتا ہوں" "میرے پاس دو درجن سولا ہیٹ ہیں" "اب تو میں عدالت میں تمہاری ضمانت بھی دے سکتا ہوں" بالکل اس طرح کہ جیسے امیر لوگ "انکم ٹیکس" کے متعلق شیخیاں بگھار کر خوش ہوا کرتے ہیں انکم ٹیکس کی طرح یہ ٹوپ ٹیکس بھی یقیناً انسانی مسرت میں ایک معتدبہ اضافہ کر سکیگا۔

اس تمام غیر متعلق، غیر مصدقہ اور غیر ذمہ دارانہ بیان کے بعد میں آپ کو یہ امر دوبارہ جتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ گو شہروں میں سولا ہیٹ پہننے والوں کی کوئی عزت نہیں معصوم دیہاتی دلوں میں اب بھی اس خاکی ٹوپ کے لئے بہت احترام ہے ۔
مسلسل دو سال کے غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ
(۱) دیہاتی باشندوں کی نگاہ میں ہر خاکی ٹوپ پہننے والا "صاحب" ہوتا ہے چاہیے اس کی چمڑی دیہات کے جوہڑ میں آرام کرنیوالی بھینس سے بھی زیادہ کالی ہو۔

(۲) وہ اَن پڑھ گنوار بھی جو ایک مغربی اور ہندوستانی کے رنگ میں امتیاز کر سکتے ہیں، خاکی ٹوپ کو انگریزیت کا شاندار مظہر سمجھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں خاکی ٹوپ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ ٹوپ پہننے والا انگریزی جانتا ہے، انگریزی بول سکتا ہے، خط یا تار پڑھ سکتا ہے، بغیر گھڑی رکھے یا دیکھے صحیح وقت بتا سکتا ہے۔

(۳) شہری تو انگریزی ٹوپی سے قریب قریب مانوس سے ہو گئے ہیں، اور اس میں انہیں کوئی اُنہیج نظر نہیں آتی۔ مگر ابھی ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے دیہاتی موجود ہیں جنہیں آج تک خاکی ٹوپ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، ان کے لئے خاکی ٹوپ ایک اچنبھا ہے۔ اور خاکی ٹوپ پہننے والا ہندوستانی اتنا ہی عجیب ہے کہ جتنا مداری کا بندر، مداری کے ڈگڈگی بجاتے ہی درجنوں بچے آس پاس کی گلیوں سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور شور مچاتے ہوئے "مداری آیا" "مداری آیا" "بندر، واہ، واہ" کرتے ہوئے مداری کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح خاکی ٹوپ دیکھتے ہی "صاحب آیا، صاحب آیا" کا ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا ہے۔ ناچتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے۔ بچوں کو دودھ پلاتی ہوئی مائیں، تاش کھیلتے ہوئے قصباتی دکاندار سب باہر نکل پڑتے ہیں، جدھر سے خاکی ٹوپ والا گزرتا ہے، اک طوفان، اک ہیجان، اک نئی زندگی پیدا کر جاتا ہے، کوئی بھاگ بھاگ کر خاکی ٹوپ کو سلام کرتا ہے۔ کوئی مسکراتا ہے۔ کوئی ہنستا ہے تو کوئی مرعوب نگاہوں سے دیکھتا ہے، مائیں

تھنوں سے چمٹے ہوئے نتھنوں کو ڈراتی ہیں، وہ رہا صاحب دیکھا تم نے صاحب،
چپ ہو جاؤ نہیں تو تمہیں کھا ہی جائیگا۔ ایک سال خوردہ موٹر ڈرائیور جس نے
اپنی زندگی کے بہترین ایام لاہور میں بسر کئے حسرت بھری نگاہوں سے خاکی ٹوپ
کی طرف دیکھتا ہے اور آہ بھر کر کہتا ہے " ہائے بابو جی "

ٹوپ پہننے والوں کے متعلق تین چار باتیں ہمیشہ فرض کر لینی چاہئیں خاکی
ٹوپ زمانۂ حال کی سلیمانی ٹوپی ہے، جسے پہن کر آدمی اپنی ہیئت کلیتاً تبدیل کر لیتا ہے
چال، اطوار، گفتار سب میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر سب لوگ اسے فوق الفطرت
انسان سمجھتے ہیں۔ لاری میں اُسے ہمیشہ فرسٹ سیٹ پر جگہ دیتے ہیں۔
چیز خریدتے وقت ہمیشہ اُس سے دگنی قیمت وصول کرتے ہیں، اور لڑائی جھگڑے
کے وقت اُس سے انصاف کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ خاکی ٹوپ
والے کو دنیا کے تمام علوم و فنون پر عبور حاصل ہے، وہ طبابت جانتا ہے اور وکالت
بھی محکمۂ مال کی مسلوں کے متعلق اپنی ناطق رائے کا اظہار کر سکتا ہے! اور گاؤں
کے دھوبی کو ریشمی کپڑے دھونے کے متعلق چند سریع التاثیر نسخے بتا سکتا ہے۔ غرضکہ
ایک دیہاتی کی نگاہوں میں وہ ریلوے انجن کے بعد دنیا کا دوسرا عجوبہ ہے!

اگر بھولے سے خاکی ٹوپ والا کسی گاؤں میں کسی شادی یا کسی دوسری

اسی قسم کی تقریب پر اپنے دیہاتی رشتہ داروں کے ہاں چلا جائے۔ تو بس ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہو جاتا ہے۔

"ارے کرسی لاؤ، کرسی، صاحب بہادر آئے ہیں، ابے کالو کے بچے، کرسی کدھر ہے، کرسی کہاں گئی"

اور کالو بیچارا غریب نوکر، گھبرا کر جواب دیتا ہے، جی کرسی تو یہاں موجود نہیں، دو سال ہوئے پر کاش کے بیاہ میں گم ہو گئی تھی، چھوٹی کھاٹ لاؤں۔

"کھاٹ واٹ کیسی؟ جا بھاگ کر لالہ ہیرا رام پٹواری کے گھر سے کرسی مانگ لا، کہہ دینا صاحب بہادر آئے ہیں۔ بھاگ کر جا دیکھتا کیا ہے؟ ابے ٹھہر تو...... دیکھنا نانا نا...... ارے کوئی ہے، سوڈا واٹر کی بوتل لاؤ، سوڈا واٹر......"

چاہے آپ لسی پسند کرتے ہوں یا دودھ، یا پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑ رہے ہوں لیکن اگر آپ نے خاکی ٹوپ پہن رکھا ہے تو نہ تو آپ کو دودھ ہی ملیگا نہ لسی نہ مٹھائی۔ بلکہ سب سے اول گاؤں کی اکلوتی سوڈا واٹر کی دکان کا سوڈا، اور ایک ٹوٹی سی کرسی بیٹھنے کے لئے۔ اس کے بعد پانچ نہایت موٹے موٹے صافے باندھے ہوئے بزرگ اور تین چار ادھیڑ عمر کی خالائیں اور پھوپھیاں آپ کے گرد جمع ہو جائینگی۔ اتنی حیرت، اتنی خوشی، اتنی مسرت کا اظہار ہو گا۔ گویا برات کے دولہا آپ ہی ہیں۔ آپ کب آئے؟ آ ہا ہا! زہے قسمت، میاں خیرو کی لاری پہ؟ اوہو ہو ہو بس ایک اسی کی لاری ذرا بری حالت میں ہے۔ ورنہ باقی لاریاں تو — اچھا'

اچھا، آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ پاؤں دبائیں؟ ابے کالو، ابے ذرا تو بیٹا ذرا تو ہی ان کے پاؤں دبا دے۔

خاکی ٹوپ والے کے پاؤں دبائے جاتے ہیں! اور دولھا پرے ایک کھاٹ پہ اکڑوں بیٹھا خشمگیں نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا ہے، بلکہ گھورتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاکی ٹوپ والے کو کچا ہی نگل جائے گا۔

اتنے میں ایک بڑی بوڑھی خاتون آتی ہیں اور کرسی کے قریب آ کر مسکرانا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک آدھ منٹ مسلسل مسکرانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے "بیٹا یہ (ٹوپ کی طرف اشارہ کر کے) ذری دکھانا تو" پھر جیسے کوئی بلوٹھی کے بچے کو اپنی آغوش میں لے لے، خاکی ٹوپ ہاتھوں میں اٹھا لیا جاتا ہے۔ "مجھے دکھانا، ہمیں دکھانا تو" کا اک شور مچ جاتا ہے "ارے یہ تو چمڑا ہے" "ولایتی ہے" "کتنا ہلکا ہے" "دیکھنا بیٹا، کہیں خراب نہ کر دینا" "ارے مجھے دو تم تو اسے توڑ ہی ڈالو گے"

پھر ایک لمبا سانس لے کر بوڑھی اماں اُسے واپس کر دیتی ہیں۔ "یہ لو بیٹا ٹوپ!"......

ٹوپ کہتے وقت چہرے سے اتنی تقدیس کا اظہار ہوتا ہے گویا بوڑھی خاتون کسی مندر میں داخل ہو رہی ہوں۔

آخر میں اگر ٹوپ پہننے والے سے قطع نظر صرف ٹوپ کی طرف توجہ کو زکیجائے

تو مندرجہ ذیل نکات برآمد ہوتے ہیں، ان نکات کو ایک الجبرے کے سوال کی صورت میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(ا) زید خاکی ٹوپ پہنتا ہے اور بکر گاڑھے کی پگڑی۔

(ب) زید اور بکر دونوں اکٹھے مال روڈ پر چہل قدمی کو جاتے ہیں۔

(پ) مال روڈ کے چوراہے پر بکر زید سے پوچھتا ہے "تم خاکی ٹوپ کیوں پہنتے ہو؟"

(ت) زید۔ خاکی ٹوپ پہن کر لُو نہیں لگتی۔

(ج) بکر۔ تو اُن مغربی باشندوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو گرمیوں میں مال روڈ پر چلتے چلتے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔

(چ) زید۔ خاکی ٹوپ پہن کر آدمی بارعب نظر آتا ہے۔

(ح) بکر۔ افغانی کلاہ کے متعلق تم کیا رائے رکھتے ہو۔۔۔۔ اور پھر تم تو اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اچھے خاصے کباڑیے معلوم ہوتے ہو۔

(خ) زید۔ خاکی ٹوپ ہلکا پھلکا ہے، سر کو تکلیف نہیں دیتا۔

(د) بکر۔ ململ کی دو پلی لکھنوی ٹوپی تم نے ضرور دیکھی ہو گی۔ جسے شاعر لوگ عام طور پر پہنتے ہیں۔ وزن کے اعتبار سے دو پلی ٹوپیوں اور خاکی ٹوپ میں وہی نسبت ہے، جو ہندوستان کی آبادی میں دیسی باشندوں اور فرنگیوں میں ہے۔

(ڈ) زید غصہ میں آجاتا ہے اور زمین سے ایک کنکر اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا ہے۔

اور کہتا ہے "او یو، بلڈی، ڈیم فول"......

(ذ) جھگڑا بڑھتے دیکھ کر پولیس کا سپاہی آتا ہے اور بکر کو گرفتار کر کے لے جاتا ہے۔

سوال کا حل۔ ایک پگڑی۔۔۔مساوی ہے ــــــ دو دن کی حوالات کے۔

شادی

شیراز ۲۸؍اکتوبر ۱۹۳۷ء

راوی حکایت کرتا ہے کہ سن ۱۹۵۰ میں موضع کانجن ماموں ضلع لائلپور
کے قریب ایک بہت بڑی سرکاری رکھ ہوا کرتی تھی۔ ایک دن دوپہر کو کہ جب
موضع کا ہر ذی حیاتی اپنے گھر میں آرام سے سویا ہوا تھا۔ ایک گبرو نوجوان جو اسی موضع
کا رہنے والا تھا۔ اور جس نے حال ہی میں لائلپور سے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اپنے
گھر سے نکل بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ سرکاری رکھ میں جا نکلا اور پھر یکا یک ایک
بہت بڑے کیکر کے درخت سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔

درختوں کی شاخوں سے سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ پھر شاخیں آہستہ سے اس نوجوان کے سر پر جھک گئیں۔ اور اس کی پیشانی پر دستِ شفقت پھیرنے لگیں۔ مگر اس طرح کہ نوجوان کو کیکر کے کانٹے بھی نہ چبھنے پائے۔

درخت نے نہایت شیریں آواز میں پوچھا۔ اے نوجوان! تو کیوں روتا ہے؟ کیا کسی نے تجھے ایذا دی ہے؟ بول تجھے کیا تکلیف پیش آئی ہے؟

وہ آواز اتنی مترنم اور لوچدار تھی۔ کہ نوجوان کی آہ وزاری بجائے کم ہونے کے اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"میں موضع کانجن ماموں کا رہنے والا ہوں۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ درخت نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ موضع کانجن ماموں کوئی اتنا بڑا قصبہ نہیں۔ وہاں کئی بھلے مانس رہتے ہونگے۔"

"اور بی اے پاس ہوں۔ پچھلے سال ہی ڈگری حاصل کی ہے۔ ابھی تک بیکار ہوں"

درخت نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "معاف کرنا کیا آپ کے گھر خالص شہد ہوگا۔" خالص ہاں ہے تو سہی"

"تو پھر گھبراتے کیوں ہو۔ تھوڑا سا شہد ڈگری پر لگا کر ہر روز چاٹا کرو بیکاری دور ہو جائے گی۔ مجرب نسخہ ہے اور آزمودہ"......

"مگر میں بے کاری دور کرنا نہیں چاہتا۔ نوجوان نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ بیکاری تو ایک لمحہ میں دور ہو سکتی ہے۔ مگر۔ مگر۔ آپ سے کیا چھپاؤں۔ بات

دراصل یہ ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی؟" درخت کی شاخیں ایک دم بول اٹھیں۔

"جی ہاں بات یہ ہے کہ پہلے میں شادی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اور ماں باپ شادی پر بہت زور دیتے تھے۔ بیٹا شادی کر لو۔ بیٹا شادی کر لو۔ دیکھو عزیز احمد نے شادی کر لی ہے۔ وہ عمر میں بھی تم سے بہت سا چھوٹا ہے۔ اور اب اس کے ہاں دو بچے ہیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے۔ وہ بے کار بھی نہیں رہا۔ یہ عورتیں جب دوسرے گھر آتی ہیں۔ تو اپنی قسمت ساتھ لاتی ہیں۔ نہ کہ اسے میکے چھوڑ آتی ہیں یہ اپنے خاوندوں کی سوئی ہوئی قسمتوں کو بھی بیدار کر دیتی ہیں۔ مٹھو رام کی زوجہ کی طرف دیکھو۔ جب سے سسرال آئی ہے۔ گھر میں روپے کی ریل پیل ہو گئی ہے، پہلے گھر میں بھنگ بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکھرام کی عورت نے اپنے سڑیل خاوند کو کتنا خوش مذاق بنا دیا ہے۔ جب دیکھو ہنستا رہتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کی بیوی وفا شعار ہے۔ اس کے لئے کھانا پکاتی ہے، بچے جنتی ہے۔ کپڑے سیتی ہے۔ محلے والوں سے لڑائی مول لیتی ہے تم بھی شادی کر لو۔ دل میں حسرت ہے۔ میرے گھر بھی ایک خوبصورت سی بہو آئے (ہاتھ پھیلا کر) یہ ننھی ہو۔ اتنی بڑی سائیکل کے پہیئے جیسی۔ پاؤں میں پازیب۔ انگوٹھے پر آرسی۔ ناک میں بلاک، یہ گھونگٹ ہو۔ اتنا لمبا۔ شرم سے بات کرے۔ میں گھر کیاں دیتی جاؤں۔ وہ چپکے سنتی رہے۔ بیٹا شادی کر لو شادی۔ اماں کی بات نہ ٹالو۔ وہ دیکھو تمہارا باپ کس افسردگی

سے حقہ پی رہا ہے۔ اس کی حالت پر رحم کرو۔

درخت نے پوچھا اور اب کیا حالت ہے۔

کس کی ؟ میرے باپ کی ؟

نہیں۔ تمہاری۔

کہتا تو ہوں۔ نوجوان نے رومال نکال کر ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔ پہلے وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ اور میں انکار کرتا تھا۔ پھر بی اے میں مجھے وظیفہ مل گیا۔ بیس روپیہ ماہانہ۔ اور گھر والے میری شادی کے متعلق سب کچھ بھول گئے۔ انہیں وظیفہ کا کچھ ایسا چسکا پڑا۔ کہ مجھے دن رات کتابوں میں گھرا ہوا دیکھنا پسند کرنے لگے۔ جوں جوں میں پڑھائی سے اکتا کر شادی اور عورت اور بچوں کا دھیان کرنے لگا۔ وہ میرے پڑھنے پر مصر ہونے لگے۔ کہنے لگے تمہیں لاہور بھیجیں گے۔ جب تم بی اے پاس کر لو گے۔ وہاں بھی تم وظیفہ لو گے نا۔ پھر بی ٹی میں داخل کریں گے وہاں بھی تم وظیفہ لو گے۔ پھر تم ہیڈ ماسٹر بنو گے۔ پھر ہر مہینہ تم بہت سی تنخواہ گھر لاؤ گے۔ اور پڑھو بیٹا اور پڑھو۔ خوب محنت سے کام لو۔ دیکھو ہم کتنے غریب ہیں اور وہ کمبخت پٹواری کتنا امیر ہے۔ یہ بات مجھے آج سمجھ میں آئی۔ کہ لوگ اپنے بچوں کو کیوں پڑھاتے ہیں۔

اب انہوں نے میری شادی کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور ادھر میری یہ حالت تھی کہ میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں اب جوان ہو گیا تھا۔ اور راہ چلتی عورتوں پر یا کنوؤں پر پانی بھرتی ہوئی لڑکیوں پر یا کھیتوں میں کام کرتی ہوئی دیہاتنوں پہ

للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنے لگا تھا۔اور اب وہ مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ درحالیکہ اس سے پہلے میں ان کی بے ڈھنگی چال پہ اور ان کی گھریلو اور نسوانی گفتار پر ہنسا کرتا تھا۔

چنانچہ میں نے یہ بہتر سمجھا۔کہ گھروالوں کو اپنے عندیہ سے آگاہ کردوں کالج میں کرسمس کی چھٹیوں کے ایام ہیں میں کانجن ماموں گیا۔اور باتوں باتوں میں اماں اور ابا سے ذکر کیا۔مثلاً

ابا۔وہ تھانا جوظہیر محمد افضل پرانے کوٹھے والے کا لڑکا اس کی شادی ہوگئی ہے۔!ور ابا حقہ پیتے پیتے آہستہ سے سر ہلا کر کہتے۔ہوگئی ہوگی۔

ابا۔اور وہ جو میرا ہم جماعت تھا۔روشن ورما اس کی بھی شادی ایک مہینہ ہوُا لاہور ہوگئی ہے۔بڑی اچھی بیوی ملی ہے۔جہیز بھی بہت ساتھ لائی ہے۔میں اس کی شادی پر گیا تھا۔

لیکن اماں چپ سے کی گھوں گھوں کے ساتھ جواب دیتیں۔شادیوں کا کیا ہے۔بیٹا۔ہوتی رہتی ہیں۔بس نہ جانے۔ان لوگوں نے کیا سازش کر رکھی تھی۔ پہلے اگر میں اتنی بات کرتا تو فوراً میری شادی کے تذکرے چھڑ جاتے تھے۔مگر اب؛ پہلے اماں ہر روز مجھے انہیں کرسمس کے ایام میں کہا کرتی تھیں۔بیٹا تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔یہ کمبخت ہوسٹل کی روٹیاں دُبلا کئے بغیر نہیں چھوڑتیں۔بیٹا شادی کیوں نہیں کر لیتے۔پھر لائل پور میں تمہیں ایک علیحدہ مکان لے دیں گے۔مگر اب ؛ اس کرسمس

کے دنوں میں اماں نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کہ تمہاری صحت پہلے سے اچھی نظر آتی ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ پڑھنے والے آدمیوں کو اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا چاہیئے۔

اور ابا حقہ پیتے پیتے کہتے۔ ہاں ہاں ٹھیک تو کہتی ہیں تمہاری اماں صبح سیر کرنے جایا کرو۔ یہ لیجئے اب شادی سے سیر پر آ گئے۔ کل کو اگر خدانخواستہ ایک وظیفہ اور مل گیا۔ تو سیر بھی بند کر دی جائے گی۔ اور کہا جائے گا۔ بیٹا سیر کرنے نہ جایا کرو۔ آرام سے بستر پہ لیٹا رہا کرو۔ اور اپنی کتابیں پڑھتے رہا کرو۔ سیر کرنے سے صبح ہوا لگ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور زکام اور انفلوئنزا اور نمونیا اور نہ جانے کیا کیا بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ بیٹا سیر کرنے نہ جایا کرو۔ گھر پر ہی تھوڑی سی ورزش کر لیا کرو۔

ایک دن میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ابا! میری صحت پہلے سے تو اچھی نہیں۔ ہاں گھر آ کر ضرور ہی اچھی ہو گئی ہو گی۔ وہاں ہوسٹل کی روٹیاں۔ اور مجھے پیچش بھی ہو گئی۔ مگر اماں نے بات کاٹ کر کہا۔ ہاں بیٹا۔ ہوسٹل کی روٹیاں تو پھر تم جانتے ہی ہو۔ پڑھائی میں یہ صعوبتیں تو دیکھنا ہی پڑتی ہیں۔

ہر وقت پڑھائی پڑھائی۔ شادی کا ذکر ہی نہیں۔ میں نے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ بی اے کے بعد نہ پڑھوں گا۔ چنانچہ اب بی اے کے بعد والدین نے بہتیرا زور لگایا۔ کہ مجھے آگے پڑھایا جائے۔ مگر میں نے ایک نہ مانی۔ اب حالت یہ ہے کہ میں گھر پر بے کار بیٹھا ہوں۔ نہ ہی نوکری ملتی ہے اور نہ بیوی عجیب مصیبت ہے "

آخر تمہارے والدین تمہاری شادی کیوں نہیں کرتے۔ درخت نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

" میری شادی تو وہ کرتے بھی ہیں۔ اور نہیں بھی کرتے۔ نوجوان نے جواب دیا بات دراصل یہ ہے۔ کہ اماں گاؤں کے کہار کی لڑکی سے میری نسبت کر دینا چاہتی ہیں۔ اور ابا کو کہارن کا یہ رشتہ پسند نہیں۔ وہ پٹواری کی لڑکی سے رشتہ کے خواہاں ہیں۔ اپنے لئے نہیں میرے لئے۔ گو میرے خیال میں انہیں اگر ایک بیوی اور مل جائے تو غالباً بے جا انکار نہیں کریں گے۔ مگر حالت یہ ہے کہ میں اب شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ارے"۔ درخت نے جھلا کر کہا۔" ابھی کہہ رہے تھے کہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور اب انکار کر رہے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

" بات دراصل یہ ہے کہ شادی کرنا چاہتا بھی ہوں۔ اور نہیں بھی۔ مجھے تو نہ کہارن کا رشتہ پسند ہے اور نہ وہ پٹواری کی سانولی لڑکی، بلکہ مجھے تو گاؤں کے لہار کی لڑکی پسند ہے۔ وہ جس کی موٹی موٹی آنکھیں ہیں۔ اور ایک عجیب ادا سے ہنستی ہے۔ بس میں اسی ادا پر فریفتہ ہوں جی چاہتا ہے وہ سامنے بیٹھی رہے اور میں اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نگاہیں ڈال کر اسے دیکھتا رہوں۔ اور اس کی عجیب ہنسی سنتا رہوں۔

" اچھا تو کیا یہ سچ ہے" کیکر کی شاخوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ کتنی عجیب ہنسی تھی۔

"کیا تم سچ مچ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس لہار کی لڑکی سے۔"

نوجوان نے عقیدت مند نگاہوں سے کیکر کے درخت کی طرف دیکھا۔ اور اس کے تنے کو ایک بوسہ دیا۔ اور مذہبی جوش سے بولا۔ یہ سچ ہے اے کیکر کے درخت۔ میں اس نیلے آسمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ یہ بالکل سچ ہے میں اس لوہار کی لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کروں۔ وہ لڑکی تین دن ہوئے گاؤں سے گم ہو چکی ہے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں اس لئے اے کیکر کے مقدس درخت کہ جس کی چھال سے جاٹ لوگ اپنے لئے تیز و تند شراب تیار کرتے ہیں میری مدد کر۔

نوجوان یہ کہہ کر کیکر کے تنے سے زور کے ساتھ لپٹ گیا اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ کیکر کی شاخیں جھومنے لگیں پھر شاخوں کی سرسراہٹ آہستہ آہستہ ایک عجیب دلکش ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ یکایک نوجوان نے کیا دیکھا کہ لوہار کی لڑکی کھڑی ہنس رہی ہے اور وہ اس کے پاؤں پڑا ہوا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"میری جان"۔ اس نے لوہار کی لڑکی کو گلے لگا کر کہا۔ تم یہاں کہاں۔

لوہار کی لڑکی نے شرما کر کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پٹواری کو تمہاری محبت کا پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ اس نے تین دن ہوئے۔ مجھ پر افسوں پڑھ کر مجھے ایک کیکر کا درخت بنا دیا۔ اور اس رکھ میں بھیج دیا۔ تاکہ تم مجھے پہچان نہ سکو۔ مگر آخر میری محبت تمہیں یہاں کھینچ لائی۔ اور محبت کے سب سے طاقت ور جادو نے مجھے پٹواری کے

سحر سے نجات دلائی۔

"ہاں، ٹھیک ہے میری جان۔" نوجوان نے رومال نکال کر ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

راوی بیان کرتا ہے کہ اس داستان کو بیتے ہوئے آج سات سو برس ہو چکے اب اس اٹھائیسویں صدی کی ہوائی تہذیب میں اس پرانی زمینی تہذیب کے پرانے افسانوں کو کون پوچھتا ہے۔ آج کل لوگ ہوائی شہروں میں رہتے۔ ہوائی ہوٹلوں میں کھاتے پیتے اور ہوائی طیاروں میں سیر کرتے اپنی زندگیاں بسر کر دیتے ہیں۔ اور کبھی بھولے سے بھی اپنی مادر وطن زمین کا منہ نہیں دیکھتے۔ کہ جہاں ہمارے اسلاف کی شجاعت اور صنعت اور الفت و محبّت کے کارنامے نصب ہیں۔ حیف ہے اس تہذیب پر۔ کانجن ماموں کے لوہار کی لڑکی اور نوجوان کی محبت کا افسانہ اتنا مشہور ہوا کہ کانجن ماموں کے پاس ہی لائلپور کے قریب "پریم نگر" نام کا ایک نیا شہر بسایا گیا۔ اور اس شہر کے وسط میں اس لوہار کی لڑکی اور نوجوان کے لئے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا گیا۔ افسوس کہ آج وہ شہر ایک کھنڈر بن کر رہ گیا ہے اور غالباً اب وہاں بہت سے کیکر کے درخت اگ آئے ہیں۔ سوچتا ہوں۔ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہماری اس ہوائی تہذیب نے سحر اور رومان کو ہماری زندگیوں سے لے کر خارج کر دیا ہے۔ ہمارے نوجوان لوہار کی لڑکیوں سے محبت نہیں کرتے

اور نہ ہی درختوں کی خوبصورت باتوں کو سنتے ہیں آج کل تاروں سے محبت جتائی جاتی ہے اور ہماری بیویاں ہسپتالوں میں جا کر بچے جنتی ہیں۔ سوچتا ہوں۔ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی ؛

عشق — اور ایک کار

ادبی دنیا مئی سنہ ۱۹۳۵ء

کل رات تعلیم یافتہ بے کاروں کے کلب میں اُپندر نے محبت کے موضوع پر ایک جذباتی تقریر کر ڈالی، محبّت ایک جذبۂ الٰہی ہے۔ خدا اور سورج کی طرح محبّت بھی نسل، قوم، ملک اور رنگت کی تمیز سے بالاتر ہے اور امیر اور غریب کو یکساں مسرّت بہم پہنچاتی ہے"۔ "آہ!" اُپندر نے آنکھیں اوپر چڑھا کر ایک جیاتی لہجے میں کہا۔ "محبّت تو فرشتوں کا جذبہ ہے۔ کل کائنات پر محبت کی حکمرانی ہے۔ محبّت خدا کا بہترین عطیہ ہے۔ جو اپنی مخلوق کو بخشا گیا ہے۔ کل کائنات کا نظام محبّت پر قائم ہے۔ آہ! محبّت!"

یہ کہہ کر اپندر نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور چُپ ہو گیا، اُس نے سمجھ لیا کہ اُس کی تقریر کے بعد کلب کے کسی دوسرے ممبر کو تنقید و تبصرہ کرنے کی جرأت نہ ہو گی، کم از کم اس کی جرأت آمیز خاموشی یہی کہے دیتی تھی۔

یہ خاموشی چند ثانیوں تک طاری رہی۔ پھر راجندر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے اُپندر! کیا کرنل نے کوئی نیا تحفہ بھیجا ہے، کل تمہارے ہاں لکھنے کے ٹیبل پر میں نے ایک خوبصورت منقش میز پوش دیکھا تھا، کیوں؟" اس پر اُپندر کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔ "اُف!" اُپندر نے حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا، "تم لوگ بشریت کے بہترین جذبات کو پاؤں تلے کی مٹی میں ملا رہے ہو، اور اُن جنتی چیزوں کو جن کی اساس روح پر قائم ہے۔ مادی چیزوں سے ملوّث کر رہے ہو۔ آج۔۔۔۔۔"

لیکن بشیر سے نہ رہا گیا۔ وہ اُپندر کا چیلنج منظور کرتے ہوئے بولا "تو اور کیا، محبت تو کیا دنیا کی ہر چیز مادیت سے منسلک ہے۔ تم اس حقیقت کو محض ایک جذباتی تقریر سے نہیں جھٹلا سکتے۔ جذبات و حسیات کی دنیا مادے سے الگ نہیں بلکہ اسی کی مخلوق ہے، جو چیز گندے گوبر میں مچھر پیدا کرتی ہے وہی چیز مناسب ماحول پا کر تمہارے دماغ کی سلوٹوں میں محبت بن جاتی ہے۔ انگلز کی کتاب "اینٹی ڈوہرنگ" میں لینن نے بھی یہی لکھا ہے۔"

بشیر جیسا کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں، بحیرۂ ہند سے اس پار تبیر اصحیح الدماغ

اشتراکی ہے۔ اور اس وقت ہندوستان میں پانچویں انٹرنیشنل (مزدوروں کی بین الاقوامی جماعت) کی بنیاد رکھنے میں مصروف ہے، اس لئے جب کبھی وہ کلب میں کسی موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ تو سوائے چند ایک سرپھرے ممبروں کے باقی سب اس کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ اور اُپندر ان سرپھرے اراکین میں سے ایک ہے۔

"کیا واہیات بات ہے"! ہری نے کہا "محبت یقیناً کوئی ارضی چیز نہیں، بلکہ ایک آسمانی جذبہ ہے، ہاں محبت ایک جذبہ ہے اور بس، اس کا مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بشیر نے اپنے حکمی نقطۂ نگاہ سے جو نتائج برآمد کئے ہیں وہ بالکل غلط ہیں، مثال کے طور پر اُپندر اور کرنا کے تعلقات کو ہی لے لو، یقیناً اُپندر اس بات کا برا نہ ملنے گا۔ اگر میں تشریح کے لئے اس کی مثال لے لوں۔ تو اب دیکھئے نا کہ کرنا اُپندر سے محبت کرتی ہے، والہانہ محبت بس مجھے اس کا اچھی طرح پتہ ہے۔ لیکن یہ محبت ایک روحانی چیز ہے، ایک روحانی کشش ہے، جو ان دو دلوں کو ایک دوسرے کے قریب کھینچ لائی ہے۔ کرنا کی محبت میں مادیت کی گنجائش نہیں، وہ ایک امیر لڑکی ہے، میرا مطلب ہے کم از کم اُس کا باپ تو دولت مند ہے، اور اب دیکھئے کہ اس جماعتی تفریق کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اُسے اُپندر سے عشق ہے۔ اُسے اُپندر کے مضامین سے عشق ہے، یہ عشق یقیناً ایک لافانی کشش ہے۔"

"ج۔س" نے اپنے حافظے پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "لکھنے والوں اور اُن کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے، میں اس بات میں ہری سے متفق ہوں۔ محبت ایک روحانی شے ہے، عورتیں مردوں سے اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا امیر وکبیر ہوتے ہیں۔"

"کیا ہندوستان میں عورتیں واقعی محبت کرتی ہیں؟" کلب کے ایک زرد رُو ممبر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ لیکن چونکہ سوال غیر متعلق تھا۔ اس لئے کسی نے اُس کی بات کی طرف توجہ ہی نہ کی۔

"میں کہہ رہا تھا" ج۔س نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

(ج۔س آج کل اپنا زیادہ تر وقت نفسیاتی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتا ہے)

"ہاں۔ میں کہہ رہا تھا، میں کیا کہہ رہا تھا، ہاں ٹھیک، ٹھیک، میں کہہ رہا تھا۔ کہ عورتیں مردوں سے اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا دولتمند ہوتے ہیں ان کی سعیٔ ناتمام یقیناً ایک روحانی جذبے کی تکمیل کے لئے ہوتی ہے، ذرا خیال فرمائیے کہ صالح عورتوں نے محبت کے مسئلہ میں ڈاکٹروں، انجنیئروں، ڈپٹی کمشنروں اور سرمایہ داروں اور دوسرے امیر طبقوں کے افراد کے مقابلے میں غریب ادیبوں، فوج کے سپاہیوں۔ مطبخ کے نوکروں اور فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کو ترجیح دی ہے۔ عورتیں عشق کے مقابلے میں اُس مرد کا انتخاب کرتی ہیں۔ جس میں کوئی غیر معمولی خصوصیات ہوں۔ اور درحقیقت عورت کی محبت

کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے محبوب کی نظروں میں جگہ پانے کے لئے کوئی غیر معمولی بات کرے۔ ادیب ہو تو ایک کروڑ الفاظ کا ایک بسیط مقالہ لکھے۔ کھلاڑی ہو تو ہاتھ پاؤں بندھوا کر ایک تالاب میں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک تیرنے کی کوشش کرے، سپاہی ہو تو ——"

مجیب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "تو گھٹنوں کے بل بازار میں چلنے کی کوشش کرے۔"

ج۔ س نے سنجیدہ لہجے میں کہا: "میرا مطلب ہے کہ مرد کوئی ایسی بات ضرور کرے جس سے وہ اپنے محبوب کی نظروں میں غیر معمولی اور فوق الفطرت معلوم ہو، جیسے اس کے سر کے ارد گرد کوئی روحانی ہالہ سا چمک رہا ہو، اب ڈیوک آف ونڈسر کی مثال لیجئے۔ ڈیوک ......"

"لیکن ہم ایک ڈیوک آف ونڈسر یا کرنا کی بات نہیں کر رہے۔"

شیام نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "ایک ڈیوک آف ونڈسر وہاں اور ایک کرتا یہاں کوئی خاص فرق نہیں پیدا کرتے۔ اگرچہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم محبت کا علمی تجزیہ کریں، تو اس تجزیے کے نتائج ان دو غیر معمولی مثالوں پر بھی اسی طرح منطبق ہوں گے جیسے دوسرے لوگوں کی محبت پر، بات یہ ہے کہ محبت کو آخر کیوں غور و فکر کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اور یہ محبت کا ایک روحانی جذبہ ہونا تو محض ایک طفل تسلی ہے۔ عشق کو مادے کے ماحول میں رکھ کر اسی آسانی

سے پرکھا جا سکتا ہے۔ جیسے نیوٹن کے قانون حرکت کو یا انسانی جلد پر پسینہ پیدا ہونے کے عملیہ کو اور سچی بات تو یہ ہے کہ مرد ہمیشہ عورتوں میں ایک حسین چہرہ اور دلکش آداب کے جویا رہتے ہیں۔ اور اگر وہ ہندوستانی ہوں، تو ایک گراں قدر جہیز بھی چاہتے ہیں۔ اور عورتیں، عورتوں کو بھی عشق و محبت کے سلسلے میں جن خصوصیات کی تلاش ہوتی ہے ان کو روحانیت سے کم لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ ایک آرام دہ گھر معقول آمدنی اور "جی حضور" شوہر کو "روحانی چیزیں" کہہ دیں۔ پس عشق کے صحیح نظرئیے میں روحانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں، عشق کی اساس بھی انسانی زندگی کے دیگر محرکات کی طرح مادے پر قائم ہے۔ اور اسی طرح سمجھی بھی جا سکتی ہے انسان کے مادی ماحول میں تغیر و تبدل ہونے پر محبت کے نظرئیے میں بھی مناسب تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف محبت میں بلکہ انسانی زندگی کے تمام سماجی تعلقات اسی ناگزیر تغیر کی وجہ سے تبدیل ہوتے، بنتے، بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے مادی ماحول میں مجنوں کو عشق جتانے کے لئے صرف ایک اونٹ کی ضرورت تھی، وہ اپنے محبوب کو محمل میں بٹھا کر اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لئے بادیہ پیمائی پر تل جاتا تھا۔ اور اپنے محبوب سے پوچھتا تھا۔

محمل سجا ہوا جو بعزمِ سفر ہے آج
اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج

لیکن آج کل کے مجنوں کے لئے اونٹ کی ضرورت نہیں، اُسے تو ایک کار چاہیئے

اُونٹ سے لے کر کار تک محبت کے نظریے میں جو جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ نہ صرف انسانی تاریخ کی مختلف منزلوں اور اس کی سماجی اور اقتصادی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں، بلکہ یہ بھی اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں۔ کہ محبّت کا عملی نظریہ قرونِ وسطیٰ کے مادی ماحول سے تبدیل ہوتا ہوا اب خالصتاً سرمایہ دارانہ بن کر رہ گیا ہے اور محبت کے موجودہ اُصول اُسی اندرونی تضاد، اور جماعتی تفریق کے زیرِ اثر ہیں۔ جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں برسرِ پیکار ہے۔ آج عشق سرمایہ دارانہ اور بورژوا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ عشق ایک جذبہ نہیں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ محبت آج کل کے مادی ماحول کے زیرِ اثر ایک محض بورژوا جذبہ ہے، جذبۂ ترحم کی طرح!

شیام نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی جیسے اُس نے ایک چٹکی سے اپنے مخالفین کے تمام دلائل کو باطل ثابت کر دیا ہو۔

اب ہر ایک کی نظر سکھو پر گڑی تھی۔ سکھو جو افسانہ نویس تھا، وہ کیا کہنا چاہتا تھا محبت کے بارے میں اُس کے کیا خیالات تھے، کلب کے سارے ممبر یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو اُٹھے۔ سکھو آج اس تمام بحث کے دوران میں منہ پھُلائے ہوئے ایک طرف بیٹھا رہا تھا۔ اب سب کی آنکھیں اپنے چہرے پر لگی دیکھ کر وہ اپنی کرسی پہ ایک عجیب بے چینی کے انداز میں ہلا کسمسایا، اور پھر کہنے لگا۔ میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں —— یہ کہانی —— آپ بیتی ہے "

" ایک دفعہ کا ذکر ہے" سکھو نے کہنا شروع کیا " مجھے ایک لڑکی سے پہلی نگاہ

ہی میں محبت ہوگئی۔ میں نے اس سے خوبتر نسوانی حسن کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا بس وہ بالکل ریفائل کی اس تصویر کی طرح تھی جسے ہم لوگوں نے پچھلے سال رائل آرٹ کی نمائش میں دیکھا تھا تو مجھے اس سے والہانہ محبت ہوگئی۔ پہلی نگاہ میں! اور جوں جوں میں اس کی طرف دیکھتا جاتا تھا میری محبت بڑھتی جاتی تھی، اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پلازا تھیٹر کے تیسرے درجے میں بیٹھا تھا۔ اور وہ فرسٹ کلاس میں تھی، لیکن پھر بھی میری محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سینما کے دروازوں میں روشنی بڑھ جاتی تو میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ اور کھیل کے ختم ہونے تک تو مجھے یقین ہوگیا کہ ربِ عظیم نے مجھے ایک لازوالی جذبے سے نوازا ہے، چنانچہ اسی جذبۂ سرمدی سے سرشار ہو کر میں نے کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکی کی کار کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا اور پھر احتیاط سے اس کا نمبر اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا۔۔۔۔۔۔

"یہ ہماری محبت کی ابتدا تھی۔ میں یہ بیان کرنا نہیں چاہتا کہ اس کے بعد ہم کہاں ملے اور کیسے، اور میری محبت کو کن نازک ترین مراحل سے گزرنا پڑا، میں یہ سب باتیں ج۔س ماہر نفسیات کے تخیلی تجربات کے لئے الگ رکھے دیتا ہوں یاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے محض دوست اس نے کبھی بھی میرے ماں باپ، گھربار یا میری سماجی حالت کے متعلق استفسارات نہیں کئے، وہ مجھے یقیناً پسند کرتی تھی۔ اور پھر ایک دن میں نے لال باغ میں

اُسے چند غنڈوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچا لیا! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ غنڈے میں نے ہی کرائے پر مہیا کئے تھے۔ اور میں ہی انہیں لال باغ لے گیا تھا۔ غرضکہ میں نے فضل بک ڈپو کے ناولوں کا ہیرو بننے کی پوری پوری سعی کی، وہ اس دن سے مجھے اور بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگی اور میں تو اس کے قدموں کی مٹی کو پوجتا تھا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ وہ مجھے اپنے سفر کی حکائتیں سنایا کرتی جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ بلادِ مغرب میں گئی تھی۔ اور میں علم الریاضی میں اپنی اُن جدید تحقیقی و تدقیقی کاوشوں کا ذکر کیا کرتا۔ جن سے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی تکذیب ہوتی تھی۔"

"بہت خوب" ج۔س نے مزاحاً کہا۔

سکھو چند ثانیوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ آخر کچھ وقفے کے بعد آہستہ سے بولا" کہانی سننا چاہتے ہو یا نہیں؟"

ج۔س نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا "سوری اولڈ مین"۔ سکھو بولا۔ "ہاں تو اب کہانی میں کیا رکھا ہے۔ میں یقیناً خوش تھا۔ اور یقیناً ایک لمبے عرصے کے لئے خوش رہتا۔ اگر اُپندر نے اپنے محبت کے جنتی نظریے سے میری عقل کو مسلوب نہ کر دیا ہوتا، پوچھو تو۔ اُپندر نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کرو، کمبخت یہیں سامنے تو بیٹھا ہے!"

"پھر کیا ہوا!" ہم سب نے ایک دم چِلا کر کہا۔

" کچھ نہیں" سکھو نے سکون آمیز لہجہ میں جواب دیا،" اور سچ بات تو ہے۔ کہ جب میں اُس کے مطالعے کے کمرے میں نمودار ہوا، تو وہ مجھ سے نہایت ملاطفت سے پیش آئی۔ وہ اُس وقت ایک آرام کرسی پر بیٹھی بلند آواز میں ٹینی سن کا کلام پڑھ رہی تھی۔ اور اپنی شیریں، نازک اور نقرئی زبان سے خود ہی محظوظ ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

" ہلو، بڈھو ٹھانی" (وہ مجھے اسی طرح پکارا کرتی ہے)

" کر ___ کی" میں نے کہا (اور میں اُسے اسی طرح بلایا کرتا ہوں)

"ہیل ___ لو" اُس نے پھر حیرانی سے کہا "یہ کیا، تم آج ایک نئی ٹائی لگائے ہوئے ہو، خیر تو ہے!"

میں نے اپنے چہرے پر ایک حزنیہ مسکراہٹ پیدا کر لی اور پھر کرسی گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا۔ " پڑھے جاؤ، کر ___ کی، پڑھے جاؤ۔ میں تمہاری شیریں آواز سننا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ نغمہ کیٹس کی بلبل کے نغمے کی طرح مجھے اپنے آپ میں تحلیل کر لے، آہ۔ تمہاری آواز کس قدر شیریں ہے۔" اُس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا، لیکن اب وہ چیخ رہی تھی، اور تلخ لہجہ میں میری نقلیں اتار رہی تھی۔"

" کل میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پنگ پانگ چیمپین شپ جیت لیا" میں نے اپنے سر کے گرد ایک روحانی ہالہ بناتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب" لڑکی نے جواب دیا۔ "کیا تم ایک دیوار کے مقابلے میں کھیل رہے تھے بدھو اڈوانی؟ مذاق کی حد ہو چکی"۔ "میں نے جذبات سے گلوگیر لہجے میں کہا" میں تم سے پیار کرتا ہوں، مذاق کی حد ہو چکی، لڑکی میری بات سنو، مجھے تم سے محبت ہے بے اندازہ محبت، لڑکی کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ چند ثانئے خاموش رہی، پھر اُس نے سنجیدہ رُو ہو کر پوچھا "تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"سچی محبت" میں نے جواب دیا "مذہب، نسل اور باپ کی تمیز سے بالاتر ہے۔ یہ ایک روحانی، سرمدی ......"

لڑکی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا "تم ایک مہینے میں کتنا کما لیتے ہو؟"

میں نے احتجاجاً کہا "میں — اشتراکی ہوں"۔

"کیا تمہارے پاس ایک کار ہے؟"

"کار تو نہیں، لیکن ایک بائیسکل ضرور ہے جو مجھے رنجیت سینما کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا مل گیا تھا"۔ میں نے تشریحاً کہہ دیا۔

لڑکی نے جھٹ گھنٹی بجائی، اور اُس کا ملازم داؤد کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا۔

"داؤد!" لڑکی نے بلند آواز میں کہا، اُس کی آواز میں غصّہ کے ساتھ عصمت عفت کے نسائی جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ "داؤد — اس

بدمعاش کو کمرے سے باہر نکال دو۔"

سکھو نے داستان ختم کردی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہو گیا کلب میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ج۔س اور اُپندر اپنی کرسیوں پر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کسی اُستاد کی گھرکی سے بچے دبک کے بیٹھ جائیں۔ آتشدان میں جلتی ہوئی لکڑیوں پر تیز تیز شعلے چمک جاتے تھے۔ یکایک کلب کے سب سے پرانے ممبر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اور سکھو کے حزیں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "بیٹا سکھو، غم کھانے سے کیا ہوتا ہے! انقلاب کے لئے کام کرو، اور خدا کا شکر کرو۔ کہ اپنی روحانی محبت کے باوجود تم زندہ ہو، ورنہ اگر تم کسی بورژوا ناول کے ہیرو ہوتے تو اس واقعے کے بعد یقیناً خودکشی کر لیتے ۔۔۔"

میری سِلور جوبلی

شیرازہ ۸ر اپریل ۱۹۳۶ء

کل پچیس سال ختم ہونے پر میری پیدائش کی سلور جوبلی منائی گئی۔ شری ہوسٹل کے بلاک بی کا آنگن (اسے آنگن ہی کہنا چاہیئے) کالی جھنڈیوں سے خوب سجا ہوا تھا۔ اور آنگن کے درمیان میں ایک بہت اونچے بانس کے اوپر سیاہ کھدر کا خوبصورت جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب اسی بانس کے ارد گرد لڑکوں نے کھڑے ہو کر میری سلامی اتاری تھی۔ گیت گاتے تھے۔ ڈھولک بجائی تھی۔ اور دیہاتی ناچ ناچے تھے۔ اب گو دس بج چکے تھے۔ مگر لڑکوں کے جوشِ عقیدت

ارادت میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اب بھی بدستور دس۔ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد "جگل کشور زندہ باد" اور "شری ہوسٹل آباد" کے نعرے لگا دیتے تھے۔

میں نے کنہیا لال کو کہا "بھئی ان لونڈوں کو سمجھا دو۔ ابھی ایک گھنٹہ کے بعد دوسرا پروگرام شروع ہوگا۔ جن لوگوں نے پوجا پاٹ کرنی ہے وہ پوجا پاٹ کر لیں۔ ایک گھنٹہ ہوتا ہی کیا ہے۔ یوں چٹکی بجاتے گزر جائے گا۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمرہ میں چلا آیا اور دروازہ بند کر کے، لنگوٹا باندھ کر اپنے بدن پر سرسوں کے تیل کی مالش کرنے لگا۔

بمشکل کوئی دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر لوگوں نے زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ میں نے کان چیرتے ہوئے پوچھا۔ کیا بات ہے کون ہے؟

باہر سے کنہیا لال کی آواز آئی۔ بلاک سے کے رہنے والے آئے ہیں۔ اور آپ کے درشن کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ درشن درشن، اس وقت کچھ نہیں۔ میں سرسوں کے تیل کی مالش کر رہا ہوں۔

باہر سب لوگوں نے مل کر ایک ساتھ کہا "درشن! درشن! درشن!!! اور ساتھ ہی دروازہ پھر زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "ٹھہرو" اور یہ کہہ کر بڑا سا تولیا اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور دروازہ

کھول کر دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

لڑکوں نے قہقہے لگاتے ہوئے تالیاں بجائیں اور فضاء جنگل کشور زندہ باد اور شری ہوسٹل آباد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

ایک لڑکا چلّا کر بولا "نعرۂ قلقلی"!

باقی سب لڑکے منہ میں انگوٹھے لے کر بولے آو۔ آو۔ آو

شری ہوسٹل کھانے پینے لوگوں کے لئے کچھ بھی ہو لیکن بیکاروں کے لئے بہشت ہے اور بہشت بھی ایسا کہ جس کے دروازے دن رات کھلے رہتے ہیں۔ اور کوئی فرشتہ ان کی نگہبانی نہیں کرتا۔ پیاسے اونٹ کو اگر صحرا میں کہیں پانی نہ ملے۔ تو وہ نخلستان کا رُخ کرتا ہے۔ اسی طرح بیکار کو اگر لاہور کے کسی اور ہوسٹل میں پناہ نہ ملے۔ تو وہ شری ہوسٹل کی طرف دوڑتا ہے۔ اور بعض آدمیوں کے لئے شری ہوسٹل زندگی کی آخری منزل ہے۔ بوڑھا چودھری جو گذشتہ دس سال سے اسی ہوسٹل میں قیام پذیر ہے۔ وہ فرسٹ ایر میں یہاں آیا تھا۔ اور اب بی اے پاس کر کے سیکرٹریٹ میں ملازم ہے۔ دن کو دفتر جاتا ہے۔ اور رات کو سنیما دیکھتا ہے۔ اسی ہیر پھیر میں اس نے بال بھی سفید کر لئے ہیں۔ لیکن پھر بھی شری ہوسٹل نہیں چھوڑتا۔ کہتا ہے کہ بارہ سال پورے ہو جانے پر مجھے یہاں سے کوئی نکال نہ سکے گا۔ اور پھر اس کمرے پر کہ جس میں مَیں متواتر دس سال سے رہ رہا ہوں۔ پورا حق ہو گا۔ پھر چاہے

اس میں رہوں۔ چاہے اسے آگ لگا دوں۔ کیوں ؟ ٹھیک ہے نا !

اور چچا چیتر بھج جس کے مخمس نما چہرے پر ہمیشہ ہنسی کی لکیریں رہتی ہیں۔ حقہ گڑگڑاتے ہوئے سر ہلا کر کہا کرتے ہیں۔ تو سچ کہتا ہے بوڑھے ! مجھے اب یہاں رہتے ہوئے نو سال ہو گئے ہیں۔ گو یہ الگ بات ہے کہ اس عرصے میں مجھ سے بی۔ اے پاس نہیں ہو سکا۔ لیکن پھر بھی دنیا دیکھتی ہے تین سال اور گذر جائیں تو پھر اس کمرے کا کرایہ بھی مجھ سے کوئی وصول نہ کر سکے گا۔

چیتر بھج کو سب لوگ چچا چیتر بھج کہہ کر پکارتے ہیں۔ کیونکہ برج کھیلنے میں اور پتے گم کرنے میں وہ ہم سب کا استاد مانا جاتا ہے اور سارے ہوسٹل میں وہی ایک ایسا شخص ہے جو ٹانگیں اوپر اٹھا کر پنجوں کے بل دس گز زمین پر چل سکتا ہے۔

شری ہوسٹل کی عمارت کوئٹہ کے بھونچال سے بہت پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے "بھونچال پروف" بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ پتلی پتلی کاغذی دیواریں، نفیس ہلکی پھلکی چھتیں۔ اگر عمارت دو منزلہ نہ ہوتی۔ تو شاید اس وقت تک ہوائی جہاز کی طرح آسمان میں پرواز کرتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ دوسری منزل موجود ہے۔ جس پر عام طور پر "بے کار" رہتے ہیں۔ ایم۔ اے اور ایم۔ سلے۔ ایل۔ ایل۔ بی، بی۔ اے۔ بی۔ ٹی، ایم۔ اے۔ ایس۔ وی اور وہاں ایک پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہے۔ لیکن اس بیچارے کو ڈان کوئکزاٹ don Quixote کا مرض ہے۔ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ کبھی سمجھتا ہے کہ اس کا کمرہ ایک بہت بلند

مینار پر واقع ہے۔ کبھی سمجھتا ہے کہ شری ہوسٹل ایک بہت بڑا قلعہ ہے جس پر دشمنوں نے اسے محصور کر رکھا ہے۔ کبھی نہانے کے کمرے میں جاتے ہوئے نلکیوں سے پانی گرتے ہوئے دیکھ کر انہیں آبشار سمجھ بیٹھتا ہے۔ کبھی بیچاری غریب بوڑھی بھنگن کو اس طرح گھورنے لگ جاتا ہے کہ وہ پریشان سی ہو جاتی ہے اور جھاڑو کو کاندھے پر رکھ کر پوچھتی ہے۔ بابو جی۔ ان کا کاک ہوت۔

اور پھر ایک اور صاحب ہیں۔ سب لڑکے انہیں آئی۔سی۔ایس کہہ کر پکارتے ہیں۔ بیچارہ دو دفعہ آئی۔سی۔ایس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہو چکا ہے۔ لیکن ہنوز شری ہوسٹل میں رہتا ہے اور اغلباً ساری عمر یہیں رہے گا۔ اس کی باتوں میں کلکٹری کی خودداری پائی جاتی ہے اور سوداٹیوں کا سا پاگل پن کبھی سوچتا ہے کہ شاید دنیا کی تمام حسین عورتیں اس پر فریفتہ ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو ہندوستان میں ہٹلر کا نائب تصور کر لیتا ہے۔ عام طور پر پی۔ایچ۔ڈی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

ہوسٹل کی زیریں منزل میں اخبار بیچنے والے۔ چنا جور گرم اور "لیلو شیریں سرد گنڈیریاں" والے رہتے ہیں۔ یہ سب میرے بھائی بند ہیں۔ انہیں مجھ پر فخر ہے اور مجھے ان پر۔ اور اگر ان بزرگوں نے کل میری مدد نہ کی ہوتی تو میری سلور جوبلی اس شان سے کبھی بھی نہ منائی جا سکتی۔

نہا دھو کر دس بجے کے بعد ہم سب لوگ آنگن میں اکٹھے ہوئے۔ جہاں دری بچھی ہوئی تھی۔ اور ایک میز اور ایک کرسی بھی صاحب صدر کے لئے رکھ دی گئی تھی۔ ہم لوگ دری پہ جا کر بیٹھ گئے اور بوڑھے چودھری کو کہا کہ وہ کرسی صدارت پہ رونق افروز ہو جائے۔ بوڑھا چودھری اس بے محل عزت افزائی سے اتنا خوش ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں وہ پونچھتا ہوا کرسی صدارت پر جا بیٹھا۔ جلسے کی کارروائی گھسیٹا رام فردوس کی نظم "ہے سب پاگل خانوں سے اچھا یہ ہوسٹل ہمارا" سے شروع ہوئی۔ جسے سب لڑکوں نے مل کر گایا۔ اس کے بعد ایڈریس پڑھا گیا جس میں میری خدمات کو سراہا گیا اور میری سلور جوبلی پر مجھے مبارکباد دی گئی۔ یہ ایڈریس بھی سب لوگوں نے کھڑے ہو کر سنا اور منظور کیا۔ اس کے بعد سب لوگ بیٹھ گئے اور بوڑھے چودھری نے کھڑے ہو کر اپنی تقریر کی۔

بوڑھے چودھری نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میرے بھائیو اور بہنو"۔ (مجمع میں سے آوازیں۔ بہن کون ہے؟ کون ہے بہن؟)

بوڑھے چودھری نے اپنا کمزور ہاتھ اٹھایا اور اشارہ کر کے بولا۔ وہ دیکھو کونے میں بھنگن جھاڑو اٹھائے کھڑی ہے۔ اس لئے میرے بھائیو اور بہنو۔ میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ اس منہ پہ اب تو سفید داڑھی آ رہی ہے۔ اس لئے اس منہ سے شکریہ ادا کرنے میں مجھے تامل محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی میں بہت خوش ہوں۔ میں اتنا ہی خوش ہوں جتنا کہ فلم مکتی میں کانن بالا کہ جب وہ . . . .

مجمع میں سے آوازیں۔ کیا ہمس کا نن بالا۔

چچا چیتر بھج (ہونٹ سکیڑ کر) ہائے ہائے۔ غضب کر دیا۔ بوڑھے چودھری نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مسٹر جگل کشور کی سلور جوبلی پر مجھے فلم چیرا ایکاڈلی کا وہ سین یاد آتا ہے کہ جب مسٹر دل محمد اور مس گوہر مقصود۔۔۔۔

مجمع میں سے آوازیں۔ کیا ہمس گوہر مقصود؟

چچا چیتر بھج (ہونٹ سکیڑ کر) گوہر مقصود؟ ہائے ہائے۔ واللہ دل توڑ کر رکھ دیا ہے۔

بوڑھے چودھری نے کہا۔ آرڈر۔ آرڈر۔ یہاں سلور جوبلی منائی جا رہی ہے۔ کوئی بھنگڑ بنارہ نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ آپ لوگ تعلیم یافتہ ہو کر بھی اس قسم کے خرافات کیسے سن سکتے ہیں۔ میں چچا چیتر بھج کو متنبہ کرتا ہوں۔ کہ وہ اس قسم کی بدمستیوں سے باز آجائیں ورنہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو فلم مانا ہری میں لامن۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک لڑکا اونچی آواز میں بولا۔ نعرۂ قلقلی!

باقی لڑکے منہ میں انگوٹھے لے کر بولے: آو۔ آو۔ آو

تیسری اور آخری محفل پونے بارہ بجے شروع ہوئی۔ ہم سب لوگ کامن روم Common Room کے اندر جا کر کرسیوں پر ڈٹ گئے۔ اس وقت تک شنہا

بھی خوب چمک اٹھی تھی۔ اور ہر ایک شخص انتظار کر رہا تھا۔ کہ کب کچن کے نوکر پلیٹوں میں مٹر اور پنیر، ساگ والا ماس، گوبھی اور پلاؤ لے کر آئیں کہ کھانا شروع ہو۔

کنہیا لال نے کہا۔ حضرات جب تک کھانا پلیٹوں میں نہ آ جائے میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ میں ایک نہایت ضروری اعلان جو اس وقت تک میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا رکھا ہے اب آپ کے سامنے رکھ دوں۔

لڑکے۔ ضرور ضرور

کنہیا لال۔ وہ اعلان یہ ہے۔ کہ اس سلور جوبلی کی تقریب کی خوشی میں ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگلے مہینہ مال روڈ پر ایک ٹیوٹرز کالج کھولا جائے جس میں ان تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو جو انگریزی، ریاضی، جغرافیہ، اقتصادیات، تواریخ، کیمسٹری، فرنچ۔ فزکس۔ باٹنی وغیرہ وغیرہ۔ میں اعلیٰ استعداد نہ رکھتی ہوں۔ اعلیٰ اور انفرادی تربیت دی جائے۔ تاکہ امتحان میں اعلیٰ نمبر پر کامیاب ہو کر ٹیوٹرز کالج کے لئے باعثِ صد افتخار ہوں اور جیسا کہ امیر سودائی نے کیا خوب فرمایا ہے۔ ع

نقش ہے غافل یہ کس کی شوخیٔ تحریر پہ

میں نے اس ضمن میں ایک اشتہاری مسودہ تیار کیا ہے۔ اگر آپ سب بھائیوں کی رائے مجھ سے متفق ہو۔ تو اس کو پڑھ کر سُنا دوں۔ لیکن میں نے اُس میں ایک خاص بات رکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ اشتہار ایک نفسیاتی نکتہ کو سمجھ کر

لکھا گیا ہے مثلاً آج کل یہ لوگ آپ کو خدا کی قسم مجھے شروع سے آخر تک پڑھئے، یا مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا۔ یا لاہور پر رحمت خداوندی کے پھول۔ اس قسم کے اشتہار نہیں پڑھتے۔ آج کل لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنا کارے دارد اور پھر اس توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھنا اور بھی مشکل ہے۔ اس کے لئے اشتہار میں ایک ہی بات کو کئی کئی بار دہرانا پڑتا ہے، تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اچھا تو وہ اشتہار یوں ہے۔

کیا؟

کیا آپ کی بیوی!

کیا آپ کا لڑکا!

کیا آپ کی لڑکی!

غیر تعلیم یافتہ ہے؟

اگر ایسا ہے!

اگر ایسا ہے!

تو۔ تو۔ تو

ٹیوٹرز کالج سے رجوع کیجئے

ٹیوٹرز کالج

ٹیوٹرز کالج

مال لاہور

کیا یہ مسودہ آپ سب لوگوں کو منظور ہے ؛

"منظور ہے"۔ لڑکوں نے چلّا کر کہا۔ مگر کھانا تو منگواؤ۔

کنھیا لال نے کہا بہت اچھا! مگر پیشتر اس کے کہ ہم کھانا شروع کریں میں مسٹر جنگل کشور سے درخواست کروں گا۔ کہ وہ بھی اپنی الوداعی تقریر سنائیں۔

میں نے بہتیرا انکار کیا۔ مگر ان لوگوں نے میری ایک نہ مانی۔ آخر مجھے کھڑا ہونا پڑا۔

حضرات! میں نے کہنا شروع کیا۔ میں آج خوشی سے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ میرے پاؤں مسرت سے زمین پر نہیں پڑتے۔ میں نہیں جانتا۔ کہ کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ فی الحقیقت آج سے میری زندگی کا نیا دَور شروع ہوتا ہے...... ایک نیا دو...... یکایک میں چپ ہو گیا کیونکہ کچن کے منشر نے کامن روم کے دروازے پر آکر زور سے کہا۔ بابوجی۔ کچن کے نوکروں نے تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ہڑتال کر دی ہے۔ آج کھانا نہیں ملیگا۔

الف لیلہ کی گیارھویں رات

شیرازہ ۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۳۸ء

"مجھے جلد بتاؤ"

ناشدہ

جب پروفیسر رات کے ڈیڑھ بجے سنیما (دوسرا شو۔ چارلی دکھیشت غوری) دیکھ کر واپس گھر پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ حسبِ معمول بڑے دروازے پر اس کی بیوی اپنے دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے کھڑی ہے۔ اور مسکرا رہی ہے۔ پروفیسر نے سوچا۔ آج بیوی خوش ہے ہنس کر کہنے لگا۔ آہا۔ میری جان!"

بیوی نے اسے ناک سے پکڑنا چاہا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر پروفیسر کا کان اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ چنانچہ اسے زور سے مروڑتے ہوئے بیوی نے نہایت

نرم لہجے میں کہا "میرے پیارے" پروفیسر چلاّیا "ہائے۔ میں مرگیا!"

بیوی نے پروفیسر کے سر پر دھپ جماتے ہوئے کہا "کس پر ترستے ہو مجھ پر" کہ ملو دھوری پر"

ہائے .... ادھوری .... میرا مطلب ہے تم پر"۔

"آؤ، میں تمہیں آدمیوں کی طرح مرنا سکھاؤں گی!" یہ کہہ کر بیوی نے کنڈی لگا دی اور پروفیسر کو کان سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئی۔

گو مکان کے دوسرے کمروں میں بجلی کے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ لیکن جس کمرے میں پروفیسر کو لے جایا گیا وہاں ایک مدھم سی شمع روشن تھی۔ فرش پر بھی سوائے ایک سخت اور کھردری چٹائی کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک کونے میں مٹی کا پیالہ اور ایک طرف ایک بڑے ٹب میں سرسوں کا تیل پڑا ہوا تھا جس میں دو چابکیں تیل میں بھگونے کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔

پروفیسر نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اس تیل میں کیا ڈبو رکھا ہے، یہ تو سانپ سے معلوم ہوتے ہیں"

بیوی جھلّا کر بولی "ہاں، ہاں، سانپ ہی تو ہیں، تمہیں ڈسنے کے لئے، انہی سانپوں سے تمہاری کھال اتاری جائے گی!" یہ کہہ کر پروفیسر کی بیوی نے ایک چابک ٹب سے باہر کھینچ لی۔ اس کی آنکھوں سے اس کے نتھنوں سے آگ کے شعلے سے نکل رہے تھے۔

پروفیسر نے سہم کر کہا "میرے اللہ، یہ تو چابک ہے!"

"چابک" کہنے کے ساتھ ہی "تڑاق" کی آواز کے ساتھ چابک مجھے جلد بتاؤ، اور پیٹھ پر پڑی، نی شدہ

خدا کے لئے بیوی مجھے مت مارو، پروفیسر نے چلا کر کہا" میں اب کبھی سنیما نہیں جاؤں گا، کمینے "بدمعاش" پروفیسر کی بیوی نے پھنکارتے ہوئے کہا،، آج گیارہ راتیں گزر چکیں تو ہر روز وعدہ کرتا ہے۔ میں اب سنیما نہیں جاؤں گا۔ میں اب سینما نہیں جاؤنگا" لیکن سورج ڈوبتے ہی جیسے تجھ پر کوئی جنون سوار ہو جاتا ہے۔ اور تو سیدھا سنیما کا رُخ کرتا ہے۔ بدمعاش بتا تیرا کیا علاج ہے۔ میں نے تجھے راتوں بھوکا رکھا۔ ڈنڈوں سے تجھے پیٹ چکی۔ میں نے تیری پیٹھ پر پتھر بھی رکھائے۔ لیکن تو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بتا! اب تجھے کیوں نہ چابک سے ہر رات پیٹا جائے؟"

یہ کہہ کر بیوی زور زور سے چابک مارنے لگی،

پروفیسر کراہ کر بولا" آہ، چابک والی، چابک والی.... مس نادیا...

پروفیسر کی بیوی تیز تیز لہجہ میں بولی" کمبخت مار کھاتے ہوئے بھی فلمی باتیں کئے جاتا ہے۔ تو لڑکوں کو کیا خاک پڑھاتا ہو گا۔ یہ کہہ کر بیوی نے ایک دو اور رسید کیں۔

پروفیسر گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گیا۔ اور مدھم لہجہ میں بولا" اچھا لگائے جا چابکیں۔ لگائے جا۔ (آہستہ آہستہ گاتے ہوئے) لگائے جا لگائے

جا، بے قرار دل، لگائے جا"

بیوی چابکیں لگاتی رہی۔ پروفیسر گانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر جب اس کے ماتھے سے خون نکل آیا۔ تو خون کو اپنی انگلیوں سے پونچھ کر کہنے لگا، میں یقیناً مر جاؤنگا، اچھی بات ہے، میں مر جاؤنگا۔ اور پھر تیرا بھی وہی حال ہوگا۔ جو لال دین ملک التجار کی بیوی کا ہوا تھا۔

"کیا ہوا تھا اسے"؟ بیوی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

جو غریب فتو کمہار کی اکلوتی شادی شدہ لڑکی کا ہوا تھا۔

"اور اسے کیا ہوا تھا"؟ بیوی نے کہا۔

اس کا بھی وہی حال ہوا تھا۔ جو سردار اوتار سنگھ سینئر سب جج کھائی گلہ کے دوست لالہ گھاسی شاہ کی بیوہ نانی کا ہوا تھا۔

بیوی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اور وہ قصہ کس طرح ہے۔

وہ واقعہ ایسا ہی ہے۔ جیسا ایک دفعہ مولینا عتیق بابری مشہور قومی کارکن کی تیسری بیوی کو پیش آیا تھا۔

پروفیسر کی بیوی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی "ہائے۔ تم بھی مجھے کچھ نہیں بتلاتے۔ اور یونہی میری جان ہلکان کر رہے ہو۔ ہائے۔ میں اب کیا کروں"؟

چابک ہاتھ سے چھوڑ دو۔ پروفیسر نے مشورہ دیا۔

بیوی نے چابک ٹب میں پھینک دی۔ اور اپنے دونوں بازو پروفیسر

کی گردن میں حمائل کر کے اس کے آغوش میں بیٹھ گئی "خدا کے لئے مجھے جلد بتاؤ، کہ لال دین ملک التجار کی بیوی کو کیا ہوا تھا! اور فتو کمہار کی اکلوتی شادی شدہ لڑکی اور سردار اوتار سنگھ......

پروفیسر نے قطع کلام کر کے درشت لہجہ میں کہا "تو سنو بیوی میں تمہیں وہ قصہ سناتا ہوں۔

ایک دن مولانا عتیق بابری مشہور قومی کارکن شہر لاہور میں موری دروازے کے باہر ایک لیکچر دینے جا رہے تھے۔ کہ راستے میں انہیں فتو کمہار مل گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ حضور مجھ پر بہت سخت ظلم ہوا ہے۔ ایسا ظلم تو نوشیرواں نے اس بڑھیا کے ساتھ بھی نہ کیا تھا۔ جو اس کے محل کے قریب رہتی تھی۔

وہ قصہ کس طرح ہے؟ پروفیسر کی بیوی نے پوچھا۔

پروفیسر نے کہا "عجیب بات ہے۔ یہی سوال مولانا عتیق بابری نے فتو کمہار سے کیا تھا..... (رک کر) تم نے یہ سوال کیوں کیا.... (بیوی کو شک کی نظروں سے دیکھ کر) کیا تم مولانا عتیق بابری کو جانتی ہو؟

"جانے میری پیزار۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو" بیوی نے چونک کر کہا۔ اور ربّ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں نے یونہی سوال کیا تھا"۔ پروفیسر کا لب و لہجہ بے حد ملائم تھا۔ اور اب وہ اپنی بیوی کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔

تو جیساکہ میں نے کہا۔" پروفیسر نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔مولانا عتیق نے پوچھا وہ قصّہ کس طرح ہے۔ تو فتو کمہار نے کہا کہ نوشیرواں کے عہد میں اس کے محل کی غربی سمت ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ پیرزال۔صدسالہ لیکن نہایت صابر اور خلیق اس کی صحت عمر کے سو سال گزر جانے پر بھی اتنی عمدہ تھی۔ کہ وہ اپنے گھر کا سب کام کاج اپنے ہاتھوں ہی سے کرتی تھی۔خود چکی میں گندم پیستی جنگل سے لکڑیاں کاٹتی۔ آگ جلاتی۔ روٹی پکاتی۔ سالن بناتی۔ وہ اپنے جھونپڑے میں اکیلی رہتی تھی۔ خدا کو یاد کرتی تھی۔ اور ہمیشہ خوش و خورم رہتی تھی۔
ایک دن اس ملک کے مشہور عادل بادشاہ نوشیرواں کا گذر اس طرف سے ہوا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا اکیلا بڑھیا کے جھونپڑے کی طرف آنکلا۔ اپنے شاندار محل کے قریب ہی بڑھیا کے اس چھوٹے سے جھونپڑے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اسے غصّہ بھی بہت آیا لیکن انصاف پسند طبیعت رکھتا تھا۔ اس لئے چپ ہو رہا۔ اور غصّہ پی کر بولا۔" اے غریب بڑھیا۔ تجھے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں"؟

بڑھیا نے کہا۔" اللہ کا شکر ہے"!

نوشیرواں بولا۔" لیکن یہ جھونپڑا..... بارش کے دنوں میں اور سردیوں کے دنوں میں جب یہاں برف پڑتی ہے...... اے بڑھیا مجھے تجھ پر بہت ترس آتا ہے..... تو میرے محل میں چلی آ۔

بڑھیا بولی۔ بادشاہ کو اگر ترس نہ آئے تو اور کسے آئے گا۔ لیکن اے بادشاہ

میں یہاں بہت خوش ہوں۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں! اللہ کا ہزار شکر ہے۔
کوئی تکلیف نہیں؟ بادشاہ نے حیران ہو کر کہا " یہ تو کیا کہتی ہے۔ یہ
ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا تیرے بوڑھے جسم کو سردی گرمی سے نہیں بچا سکتا۔ یہاں چوروں
اور ڈاکوؤں کا خطرہ ہے۔ میں تجھ سے کہتا ہوں۔ تو میرے محل میں چلی آ۔ وہاں
تجھے ہر طرح سے آرام ہوگا۔ اور نوکر چاکر اور کھانے کے لئے انواع واقسام کی اشیاء
رہنے کے لئے عمدہ جگہ

بڑھیا لالچ میں آگئی۔ اور بادشاہ کے محل میں آگئی۔ بڑھیا کی جھونپڑی مسمار
کر دی گئی۔ اور اس طرح نوشیرواں کے محل کے غربی کونے میں جو عمارتی نقص تھا
وہ دُور ہو گیا۔

" پھر کیا ہوا" پروفیسر کی بیوی نے مدھم آواز میں پوچھا۔ اسے نیند آرہی
تھی۔

اس کے بعد بڑھیا بڑے آرام سے رہی۔ بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا۔ کہ
اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بڑھیا کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہی دُنیا
کی تمام نعمتیں ملنے لگیں۔ کچھ دن تو وہ بہت خوش و خرم رہی۔ پھر آہستہ آہستہ
اس کی صحت میں نمایاں کمزوری پیدا ہونے لگی۔ اب وہ ایک چڑچڑی، اور
کاہل الوجود بڑھیا بن گئی تھی۔ پہلے اسے زکام ہوا۔ پھر کھانسی اور آخر میں نمونیا
دس پندرہ روز بیمار رہنے کے بعد وہ بیچاری اپنے جھونپڑے کو یاد کرتی ہوئی

اس دنیا سے چل بسی۔

ارے ؟

ہاں تو اور کیا پروفیسر نے کہا "مرتے وقت اسے کہا گیا۔ کہ نوشیرواں نے اس کے ساتھ کیا انصاف کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ مر رہی تھی۔ تو اس نے بادشاہ کو اپنے سامنے بلایا۔ اور بولی "تم نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا ہے۔ جو ریاست پونچھ کے موچی کے ساتھ کوہ کھوڑی ناڑ کی نیلم پری نے کیا تھا"

بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ یہ حکایت کیا ہے ؟

لیکن پیشتر اس کے کہ بیچاری بڑھیا جواب دیتی۔ فرشتہ اجل نے اس کی روح قبض کر لی۔

پروفیسر بولا۔ فتو کمہار نے مولانا عتیق بابری کو یہ کہانی سنا کر کہا حضور میرے ساتھ بھی بس اسی طرح ظلم ہوا ہے بات یہ ہوئی کہ میں ــــ"

مولانا عتیق بابری نے جیب سے گھڑی نکال کر کہا۔ فتو کمہار مجھے اس وقت فرصت نہیں میں ابھی موری دروازے کے باہر ایک تقریر جھاڑنے جا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم کل مجھے بابا حق حق اور چالیس چور کی سرائے میں ملو۔ تو میں تمہاری داستان سن لوں گا۔ اور ٹھہرو سنو اپنے ساتھ ایک پستول ضرور لیتے آنا۔ اور سرائے کے دروازے پر ٹھہر کر تین بار دستک دینا۔ ایک بار تیز اور دو بار ہلکی۔

اس کے بعد ایک حورِ شمائل تمہارے لئے دروازہ کھول دے گی۔ خبردار اسے دیکھ کر گھبرا نہ جانا۔ وہ تمہیں دیکھ کر تین بار مسکرائے گی۔ ایک بار نیز دو بار ہلکے ہلکے۔ اور پھر تمہارے رخساروں پر تین بوسے دے گی۔ ایک دائیں طرف۔ دو بائیں طرف۔

دو بائیں طرف؟ فتو نے کان کھجلاتے ہوئے کہا۔

ہاں ہاں، مولانا عتیق بابری نے نہایت آہستہ سے کہا۔ ان باتوں کو اچھی طرح سے یاد رکھو۔ ان پر تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر تم ذرا بھی چوک گئے۔ تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا، جو اخبار نیلمی کے ایڈیٹر کامس ریواز کے گھر کے گرد چکر لگانے پر ہوا تھا۔

بہر قصہ ....

چچ .... چچ .... مولانا نے کہا۔ مجھے اس وقت فرصت نہیں۔ باباحق اور چالیس چور کی سرائے میں سب کچھ بتاؤں گا۔ میری بات اچھی طرح سمجھ لو جب وہ حسینہ تمہارے رخساروں پر تین بوسے دے چکے۔ تو تمہیں آگے بڑھ کر اس کے کان میں یہ الفاظ تین بار کہنے ہوں گے۔

اور وہ الفاظ کیا ہیں؟

مولانا نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آہستہ سے فتو کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔ "کالابل۔ کالابل۔ کالابل"

کالابل۔ یہ وہی بل تو نہیں جس کے متعلق اخباروں میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
لیکن مولانا عتیق بابری ایک چھلاوے کی طرح گم ہو چکے تھے۔ بیچارا افنو کمہار اسی طرح حیران پریشان گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے سردار اوتار سنگھ مل گئے انہوں نے چھوٹتے ہی کہا کیوں بے"
پروفیسر کی بیوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا اوں۔اوں مجھے نیند آرہی ہے۔ باقی کل سہی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پہلے یہ وعدہ کرو۔ کہ اب کبھی سینما نہیں جاؤ گے۔
تمہاری قسم اب کبھی نہیں جاؤنگا۔ پروفیسر نے جواب دیا اور کل تمہیں سردار اوتار سنگھ سینیر سب جج کے دوست لالہ گھاسی شاہ کی نانی کی حکایت سناؤں گا بہت دلچسپ ہے اچھا اب تم سو رہو! اور مجھے تو بھوک لگی ہے۔ دیکھوں شاید کہیں سے کچھ مل جائے۔
یہ کہہ کر پروفیسر اٹھا اور کمرے کے اس کونے میں گیا۔ جہاں آبخورہ رکھا ہوا تھا۔ کیا دیکھتا ہے آبخورے کے پاس ہی مٹی کا ایک پیالہ بکری کے دودھ سے لبالب رکھا ہے! اور اس میں کھجوریں پڑی ہیں۔
دوسرے دن وہ دن بھر لڑکوں کو پڑھاتا رہا۔ لیکن جب شام کے پانچ بجے وہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلا تو اس کے قدم خود بخود سینما گھر کی سڑک کی طرف مڑ گئے اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتے گئے۔ راستہ میں اسے ایک آدمی ملا۔ جو گھنٹی بجا بجا کر پکار رہا تھا
" بڑے مزے کا کھیل۔ چارلی۔ دیکھشت۔ بلی موریا"
پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سینما گھر میں جا داخل ہوا +

آنکھیں

ابھی اس دن کی بات ہے۔ میں اور نریندر سہ پہر کو مال روڈ پر چہل قدمی کے لئے نکلے۔ یکایک چلتے چلتے نریندر نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔ دیکھو۔ اس کار کی پشت پر کیا لکھا ہے؟

"کیا لکھا ہے"؟ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نریندر کو غیر متعلق باتیں کرنے کی کتنی بری عادت ہے۔" اپنے ہمسائے کی بلی سے محبت کرو"۔ کتنا عجیب مقولہ ہے" نریندر نے کہا۔

میں نے کہا تمہیں پڑھتے وقت غلطی ہوئی ہوگی ہمسائے کی بلّی نہیں ہوی ہوگی
"ایک ہی بات ہے۔ نریندر نے جواب دیا۔ دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔
دونوں کی کھال سمور کی طرح ملائم ہوتی ہے اور پنجے تیز۔ اور جب پیار سے گود میں
اُٹھالو۔ تو خرخر کرنے لگ جاتی ہیں۔
مگر وہ لکھا کہاں ہے؟
نریندر نے ہاتھ کے اشارے سے آدھ میل دور ایک کار کی پشت پر اشارہ کیا
جو تیز رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔" وہ دیکھو۔ وہاں!"
میں نے مسکرا کر کہا معاف کرنا، مجھے اپنے آپ پر کبھی دوربین ہونے کا گمان
نہیں ہوا۔
لیکن نریندر نے سنجیدہ لہجے میں کہا شیام۔ کیا تم سچ مچ اُس فورڈ کی پشت
پر لکھے ہوئے سفولے کو نہیں پڑھ سکتے؟ میرے خیال میں تمہاری بینائی میں ضعف
آگیا ہے۔ کیا تم نے کسی عینک ساز......
عینک ساز جائے جہنم میں، میں نے تنگ آکر کہا۔ میری آنکھیں چنگی بھلی
ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ....
لیکن نریندر نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔
میرے خیال میں یہ سینما دیکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم ہفتے میں چار بار سینما نہ
جاتے۔ بلکہ شریف آدمیوں کی طرح صرف ایک بار ایک تصویر دیکھنے پر قناعت

کرنے۔ تو......

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ میں سینما کا اتنا شائق نہیں کہ جتنے تم خود ہو۔ میں نے ہری واس صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اور تم نے چار بار، میں نے "سکم کابگ المعروف" شوہر کی بھوک ہڑتال" صرف چار بار دیکھا ہے۔ اور تم نے کئی بار دیکھا ہے۔ دیکھو سچ سچ ......

نریندر نے کہا۔ صرف پچپن مرتبہ گیا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ مجھے اُس فلم میں ایک گانا بہت پسند ہے "شاہا۔ کھالے مکی دے دانے" میرے خیال میں یہ بہترین ہندوستانی فلم ہے جس میں جنگل کے مناظر اتنے دلفریب دکھائی دیتے ہوں لیکن ان باتوں سے تمہاری بینائی تو درست ہونے سے رہی۔ کیا تم اس سائن بورڈ کو پڑھ سکتے ہو جو اُس دواساز کی دکان پر لگا ہے۔

کونسا سائن بورڈ۔ مجھے تو وہاں کچھ نظر نہیں آتا۔

نریندر ہنسنے لگا۔ ایک طنزیہ ظالمانہ ہنسی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا میں نے اُس کا شانہ پکڑ کر کہا۔ خدا کے لئے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ میں ملٹن نہیں۔ میں اپنی بصارت نہیں کھونا چاہتا۔

نریندر نے کہا۔ آؤ۔ ابھی چلتے ہیں۔ وہ پرے "باوا نرائن سنگھ ماہر امراض چشم" کی دکان ہے۔

باوا نرائن سنگھ ماہر امراض چشم سے ملاقات ہونے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک

نیز و تلخ قسم کا اشتراکی ہے ۔ وہ پہلے دی آئنا میں ایک یہودی ڈاکٹر سے آنکھوں
کی بینائی درست کرنے کا کام سیکھتا تھا ۔ پھر جب نازی آئے تو انہوں نے یہودی ڈاکٹر
کو اس بنا پر قید کر لیا ۔ کہ وہ لوگوں کی آنکھیں ذرا ضرورت سے زیادہ درست کر دیتا
تھا ۔ اُسے نازی کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے اس لئے اُنہوں نے یہودی ڈاکٹر کو
برگنسٹین کے مقام پر ایک Concentration Camp. میں قید کر دیا ۔ اور باوا
نرائن سنگھ کو وی آئنا سے بھاگتے ہی بنی ۔

جب باوا نرائن سنگھ اپنے دی آئنا کے قیام کے حالات سنا رہا تھا ۔ تو
میں نے اسے ٹوک دیا ۔ مجھے سیاسیات عالم پر تبصرہ نہیں چاہیئے ۔ میں نے کہا ۔ اور
میں ہر ہٹلر کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتا ۔ مجھے دوائی چاہیئے ۔
میں اپنی آنکھوں سے معائنہ کرانا چاہتا ہوں ۔ اور بس ۔

باوا نرائن سنگھ نے ہنستے ہوئے ثریندر سے کہا ۔ تمہارا دوست ایک عجیب
آدمی معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن تم اسے یہ کیوں نہیں بتاتے کہ جب تک تمہاری آنکھیں
ہیں ۔ تم اپنے آپ کو سیاسیاتِ عالم سے الگ نہیں رکھ سکتے ، یہ زندگی کا پہلا
اصول ہے ۔ میرے خیال میں تمہارے دوست کو ضعف بصارت کا مرض اس لئے
بھی ہے ۔ کہ اُس نے موجودہ تواریخ کا غلط مطالعہ کیا ہے ۔ اسے دو عینکوں
کی ضرورت ہے ۔ ایک اپنی آنکھوں کے لئے ۔ اور دوسری اپنے دماغ کے لئے ۔

میں نے جھنجلا کر کہا ۔ مجھے عینک لگانے والوں سے سخت نفرت ہے ۔

"گاندھی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"۔ باوا نرائن سنگھ نے فوراً پوچھا میں بھونچکا رہ گیا۔ اُس کا لہجہ کتنا غیر مقدس اور بازاری تھا۔ کوئی اشتراکی ہی ایسے الفاظ استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے اسے زک دینے کی ٹھان لی۔

گاندھی کو تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ تو ایک دیوتا ہے۔ میں نے کہا۔ وہ شری رامچندر جی کا اوتار ہے۔ میں اس کی پوجا کرتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ عینک استعمال کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ شاید اس سے سچائی اور اہنسا کے اصولوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان کی بینائی کمزور ہے۔ میرا اعتقاد ہے۔ کہ گاندھی جی عینک کے بغیر بھی ہر چیز کو نہایت صاف اور واضح صورت میں دیکھ سکتے ہیں تمہیں یہ یاد رہے ڈاکٹر کہ میں ایک پکا کانگرسی ہوں۔ اور گاندھی جی کے معجزوں میں والہانہ اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرے ان چند جملوں نے بیچارے اشتراکی ڈاکٹر کے منہ پر مہر لگا دی۔ غریب کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ آہستہ سے اُس نے میری دونوں آنکھوں میں کسی سیال شے کے چند قطرے ٹپکا دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے ایک پُر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ یہ ایک دوائی ہے۔ جو تمہارے حلقۂ بصارت کو بڑھا دیگی۔ اس شیشی کو گھر لے جاؤ۔ اور دن میں دو تین بار اس کے چند قطرے اپنی آنکھوں میں ٹپکاتے رہنا۔ تیسرے دن میرے پاس تشریف لے آئیے۔ پھر میں آپ کی آنکھوں کا آخری معائنہ

کر کے آپ کی عینک کے لئے نمبر تجویز کر دوں گا" گوڈ بائی"

اُس بے رنگ سیال دوائی کے چند قطروں نے مجھ پہ آشکارا کر دیا کہ بینائی تو محض ایک اضافی شئے ہے اور دراصل آنکھوں کی پتلیوں کے قطر پر منحصر ہے۔ پہلے میں خیال کرتا تھا کہ آنکھیں روح کا آئینہ ہیں۔ کہیں دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر دل کے ویرانے میں عجیب سے سائے کانپنے لگ جاتے تھے۔ اور شعری امنگیں بھری لہروں کی طرح دل کے ساحل پر ٹکرانے لگتی تھیں۔ اب پتہ چلا کہ آنکھیں روح کا آئینہ نہیں ہیں۔ بلکہ محض ایک کیمرہ ، اور آخر محض ایک معمولی سے کیمرہ کے لئے دل کے ویرانے میں کیوں عجیب سے سائے کانپنے لگ جائیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اُس بیرنگ سیال دوائی کے چند قطروں نے اس حقیقت کو مجھ پہ آشکارا کیا۔ ان چند قطروں نے میری آنکھوں کی پتلیوں کے قطر کو بڑھا دیا جس سے مجھے دنیا کی ہر چیز پھیلی ہوئی اور عجیب سی نظر آنے لگی۔ ساری کائنات ایک سبز اور نیلے رنگوں کے ملے جلے سائے میں کھوئی گئی۔ کہیں کہیں اس میں عجیب عجیب اور نادر رنگوں کے نخلستان سے آباد تھے۔ ایسے نیلے، جیسے کوئی ساکن جھیل، اور ایسے نارنجی جیسے غروب آفتاب کا پگھلا ہوا سونا، سڑکوں پہ بجلی کے کھمبے یکایک بلند ہونے گئے۔ اور آسمان سے جا ملے۔ وہ ایک ایسی جھلملاتی ہوئی ندی کے پانی کی طرح چمک رہے تھے۔ جو زمین سے نکل کر جنت کی طرف بہتی جا رہی تھی۔ ایک مدھم،

عجیب سی شئے۔ ایک سرخ ساڑھی پہنے ہوئے میرے پاس سے گزر گئی۔ یکایک سورج کی کرنوں نے اُسے چھو لیا، اور اس کی ساڑھی کا کنارہ ایک شعلے کی طرح بھڑک اُٹھا۔ اور میں نے چلا کر کہا، تمہیں آگ لگ گئی ہے۔ اپنے آپ کو بچا لو۔ یہ شعلہ اتار کر پھینک دو۔ ٹپاٹپ ٹپاٹپ ایک تانگہ بھاگا جا رہا تھا۔ اور اُس کا پائیدان ایک ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ یکایک تانگہ میرے قریب سے گزر گیا۔ اور وہ ستارہ ٹوٹ کر آتش بازی کے پھولوں کی طرح لاکھوں چمکتے ہوئے ذرّوں میں بکھر گیا، وہ روشنی کا ایک فوارہ تھا۔ جو یکایک تاریکی میں پھوٹا۔ اور اپنے کروڑوں دمکتے ہوئے موتیوں کی تابانی سے نگاہ کو خیرہ کرتا گیا۔ سہ منزلہ مکانوں کی قطاریں قدرے غیر واضح سلسلہ ہائے کوہ کی طرح تھیں۔ آدمی روشنی اور سایوں کے دھندلکے سے نظر آتے تھے۔ اور عورتیں سوتے اور نیلم کی جھیلیں؛ اور بازار میں قدم رکھنا الف لیلہ کی غیر مرئی اور سحر زدہ کائنات میں داخل ہونا تھا۔

ہاں کبھی کبھی یہ ضروری ہے کہ آدمی سچائی کو پانے کے لئے اپنی آنکھوں کا معائنہ کروا لے اپنی بصارت کو درست کرنے کے لئے دنیا کو اک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھ لے۔ یہ چیز ہمیں اضافی نظریے کی تہ تک لے جاتی ہے۔ اور سب چیزوں سے بڑھ کر سچائی کی حیثیت خالصتاً اضافی ہے۔ وہ کبھی یکساں نہیں ہوتی بلکہ نیلم کے ٹکڑے کی طرح مختلف پہلوؤں سے جھلکتی ہے۔ ایک لمحے میں وہ سرخ ساڑھی کے زریں شیشے کی طرح چمکتی ہے۔ اور دوسرے لمحے میں شعلے کی طرح

بھڑک کر پگھلے ہوئے لاوے کی ندی بن جاتی ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ۔ وہ پوری سچائی نہیں۔ بلکہ سچائی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن جب بے رنگ سیال دوائی کے چند قطرے آنکھ کی پتلی کا قطر بڑھا دیں۔ تو آنکھ روشنی زیادہ جذب کر سکتی ہے۔ تانگے کے پائیدان ستارے بن جاتے ہیں۔ عورتیں سونے اور نیلم کی جھیلیں۔ سچائی میں جھوٹ کا انعکاس ہوتا ہے۔ اور عدم تشدد اعلائی تشدد کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ زیادہ روشنی جذب کرو۔ گاندھی جی مرن برت رکھتے ہیں۔ اور ہندوستانی رہنما عوام سے طاقت چھیننے کی کوشش کرتے ہیں پنڈت کا کہنا ہے کہ صرف گاندھی جی کی قیادت ہی ہمیں آزادی دلا سکتی ہے۔ قیادت اور طاقت کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ کہ ہمارے گاندھی کی قیادت اسی قدر مفید نہیں کہ جس قدر اٹروپین کے چند قطرے ۔۔۔۔

نقد و نظر

(ایک پیروڈی)

خطرناک کمپنی چھپی بھیڑی المعروف شیطان کی معشوقہ مصنفہ ادیب شہرانوی

ناشران بنگال جنرل کتب گھر بازار ماہی سیوال - امرتسر

قیمت ڈھائی آنہ ، خریداروں سے دو آنہ کتب فروشوں سے

ڈیڑھ آنہ " ردی خریدنے والوں سے دو پیسے)

خطرناک کمپنی بھیڑی المعروف شیطان کی معشوقہ ایک حیرت انگیز ہوش ربا اور

سنسنی خیز ناول ہے جس میں جناب ادیب دھرا ٹوی نے اپنے شہوار قلم کی

جولانیاں دکھائی ہیں۔ جناب ادیب دھڑانوی ایک مشہور ادیب ہیں۔ اور اس وقت تک ایک درجن کے قریب ناول لکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ جو منصۂ شہود پر آیا ہے۔ مولانا حسرت کے اس بیان کی تکذیب کہ اُردو میں ناول سرے سے ہے ہی نہیں "خطرناک پھلجھڑی" المعروف شیطان کی خالہ سے ہو جاتی ہے۔ ناول کیا ہے۔ ایک مرقع غم ہے۔ ایک نفسیاتی موازنہ ہے۔ ایک اقتصادی پندار ہے۔ ایک اجتماعی شگوفہ ہے۔ ایک قومی و ملّی کارنامہ ہے۔ اور اردو زبان کا شاہکار ہے۔ باب اوّل کا پہلا پیرا ملاحظہ ہو:-

"ناظرین دیکھئے۔ وہ رانا اجے سنگھ کے سنہرا جے نگر کے قلعے اجے گڑھ پر راجپوتی پرچم کس آن بان سے لہرا رہا ہے۔ لیکن آہ۔ وہ کیا ہے۔ ہاں ہاں! یہ ہمارے قصّہ کی ہیروئن ہے۔ چمپا، چمپا۔ جس کی چمپئی زلفوں میں اس کا سرمئی چہرہ گویا سفید سفید بادلوں میں چاند کا خوب صورت چہرہ جھلمل جھلمل کر جھلملا رہا ہے۔ اس کی چال متوالی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ ننگے پاؤں قلعے کے سامنے والی کھردری اور سخت سڑک پر چلتی ہوئی آ رہی ہے اس کے پاؤں سے لہو بہ رہا ہے۔ آہ بے چاری چمپا ناز و ادا سے پالی ہوئی، اپنے ماں باپ کی لاڈلی چمپا۔ لیکن ناظرین، دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایں یہ کیا۔ وہ گھڑ سوار کس تیزی سے چمپا کی طرف آ رہا ہے۔ کیا یہ اجے سنگھ کا بیٹا، کنور بجے سنگھ تو نہیں؟ (یقیناً وہی ہے)

اس کا سُرخ چہرہ، سیاہ مونچھیں اور گندمی کان آفتاب کی کرنوں میں گویا موتیوں
کی طرح چمک رہے ہیں۔ کیا سجیلا جوان ہے۔ لو وہ اب چمپا کے بالکل قریب
آگیا۔ وہ اب گھوڑے پر بالکل جھک گیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے طاقتور
ہاتھوں میں چمپا کو زمین سے اٹھا لیا۔ اور اپنے گھوڑے پر بٹھا کر ہوا ہو گیا قلعے
کی دیواروں سے گولیوں کے سنسنانے کی آواز آئی۔ لیکن وہ گولیاں بلا وجہ چلتے
ہوئے دو بے وقوف راہ گیروں کو لگیں اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔

چمپا کون تھی؟ وہ سجیلا جوان کیوں اُسے اُٹھا کر لے گیا قلعے کی دیواروں
سے گولیاں کیوں چلیں؟ اور وہ راہ گیر کون تھے؟ ان سب باتوں کا جواب
آپ کو اگلے باب میں ملے گا۔ ناظرین بصد شوق مطالعہ کریں۔

غرضیکہ ناول کے پہلے باب سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اردو میں ناولوں
کی کوئی کمی نہیں مصنف نہ صرف منظر کشی کا ماہر ہے۔ بلکہ خود کشی کا بھی چنانچہ
خطرناک پھلجھڑی جس میں آپ کو بعد میں پتہ چلیگا۔ چمپا کا دوسرا نام ہے۔
ناول کا ہر کردار آخر میں خود کشی کر کے مر جاتا ہے۔ اور ناول کے اختتام پر
سوائے مصنّف کے اور کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔ کتنی زبردست ٹریجڈی ہے
کہ ہر پڑھنے والے یا دوسروں سے پڑھ کر سننے والوں کی آنکھوں میں بے اختیار
آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ تبصرہ نگار کا اپنا تجربہ ہے کہ وہ ناول کو پڑھ کر سات دن
روتا رہا۔ اور آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

حضرت ادیب دھرالوی حیاتِ انسانی کی نفسیاتی گہرائیوں کو جس خوبی سے بیان کر جاتے ہیں۔ وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو وہ حصہ جہاں چمپا دل کے "بدمعاش" کی جوتوں سے مرمت کرتی ہے۔

چمپا۔ موا مردار (جوتے لگاتی ہے)

بدمعاش۔ ہائے میں مر گیا۔

چمپا۔ تجھے ایک باعصمت عورت کی طرف دیکھنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ یہ نجیب گڑھ ہے (یعنی یہ ہندوستان ہے) (جوتے لگاتی ہے)

بدمعاش۔ میری اماں —— آہ میری چمپا مجھے معاف کر دو۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ یہ نجیب گڑھ ہے۔ اور یہاں عورتوں کی طرف دیکھنا منع ہے....
مجھے .... مجھے دو سوئیاں لا دو کہیں سے

چمپا۔ (جوتی چھوڑ کر جیب سے سوئیاں نکالتے ہوئے) یہ لے دو سوئیاں
تو کیا کرے گا۔ اب انہیں لے کر

بدمعاش۔ (اپنی آنکھیں سوئیوں سے نکال دیتا ہے)

چمپا۔ (دوسری جوتی چھوڑ کر) آہ! یہ تو نے کیا کر دیا۔

بدمعاش۔ (سسکتے ہوئے) میں ان آنکھوں کو سزا دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے پاپ کیا ہے۔ ایک باعصمت عورت کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ میں نے اب انہیں اپنے جسم سے ایک گندے عضو

کی طرح کاٹ کر پھینک دیا ہے۔ گناہگار آنکھیں، آہ

چمپا (روتی ہوئی) آہ ظالم یہ تونے کیا کر دیا۔ (بدمعاش سے لپٹ جاتی ہے) ہیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی پیارے:

بدمعاش۔ میرا دامن چھوڑ دے۔ اے مایا کی دل فریب صورت۔ گو میری آنکھیں اب اندھی ہو چکی ہیں لیکن میری چشم بصیرت اب روشن ہو گئی ہے۔ اور میں اپنے بھگوان کو صاف دیکھ سکتا ہوں (گاتا ہے)

بھیج نام ہری کا رے

چمپا۔ تم کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر۔

بدمعاش۔ میں اپنے بھگوان کو ملنے جا رہا ہوں۔ آج سے تم میری ماں ہو۔ ماتا چمپا۔ (گاتا ہوا خودکشی کرنے کے لئے چلا جاتا ہے)

چمپا۔ (حیرانی سے) اس نے مجھے ماں کہا۔ ماں! آہ! ماں کتنا پیارا لفظ ہے۔ ماں! ماں!! ماں!!! ——— مجھے اپنی ماں کی یاد ستا رہی ہے (خودکشی کرنے کے لئے چلی جاتی ہے)

انسانی جذبات اور اُن کے نفسیاتی پس منظر کی کتنی صحیح اور سچی ہندوستانی تصویر ہے اور ہمارے چند ایک سر پھرے ترقی پسند ادیبوں کے لئے ایک تازیانہ عبرت، کاش یہ لوگ جناب ادیب دھڑا لوی کی رہنمائی میں اردو ادب کی خدمت کریں۔ تو ملک و قوم کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکینگے۔

اس سین سے آپ پر یہ بھی ثابت ہو گیا ہو گا۔ کہ جناب ادیب دھڑانوی میں
ڈرامائی صلاحیت بھی بہت ہے۔ اور اس لحاظ سے اُن کا نام شکسپیئر، برنارڈ شا
ابسن۔ اور شا کے ساتھ لیا جا سکتا ہے اور ایک طرح سے تو یہ لوگ ادیب دھڑانوی
سے کچھ کم درجہ ہی رکھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ محض ڈرامہ نگار ہیں۔ اور ادیب
دھڑانوی ایک اعلیٰ پایہ کے ناول نگار بھی ہیں۔

الغرض یہ ناول آپ کے مطالعہ کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔
لکھائی چھپائی بہت دیدہ زیب سرورق پر مس کجن اور شام پیاری کی تصاویر
ہیں۔ اپنے مقامی کتب فروش سے طلب فرمائیے۔

"گل شکوہ بجواب گل خنداں"

از حضرت ماہی مچھلی شہری جانشین حضرت ضریر میانی
تلمیذ سخن علامہ۔ غرخشک کھوکھرانی

ناشران:- دار الادب مچھلی شہر۔ گلی چوہے ماراں۔ محلہ جو ہاٹاں قیمت درج
نہیں۔ غالباً امرا سے پچیس روپے۔ کالج کے طلبا سے پانچ روپے اور شائقین
ادب سے پانچ آنے۔

آخر حضرت ماہی مچھلی شہری نے اپنے احباب اور قدر دانوں کے اصرار
پیہم سے متاثر ہو کر اپنا مجموعہ کلام شائع کر دیا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔

کہ شاعر پورب کا یہ دل آویز کلام جو شاعر مشرق و مغرب پچھم اور جنوب پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ آخر دارالادب جیسے موقر ادارہ کی مساعی جمیل سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ (اور دراصل یہ کام انہی کے بس کا تھا)

حضرت ماہی مچھلی شہری جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے۔ مچھلی شہر کے رہنے والے ہیں۔ صرف رہنے والے ہی نہیں۔ بلکہ پیدا بھی وہیں ہوئے۔ اور جس دن سے پیدا ہوئے وہیں کے ہو رہے ہیں۔ یعنی شہر "مچھلی شہر" سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ اور پرانی وضع کے بزرگ ہیں! اور ان پرانی وضعداریوں کو آج تک نباہتے چلے آرہے ہیں۔ لے دے کے ہمارے مچھلی شہر میں (کیونکہ تبصرہ نگار خود مچھلی شہر کا رہنے والا ہے) یہی ایک پرانے مغلئی دور کے بزرگ رہ گئے ہیں۔ ورنہ آج کل تو سارا شہر ان متشاعر، مغرب زدہ لونڈوں سے بھرا پڑا ہے۔ جو گلی گلی گنگناتے پھرتے ہیں۔

مچھلی شہر کی خاک پاک سے اُردو زبان کے بہترین انشا پرداز، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت جلال مچھلی شہری۔ کمال مچھلی شہری۔ ہلال مچھلی شہری۔ فارغ البال مچھلی شہری۔ غرضیکہ کس کس کا ذکر کیا جائے اس سے پہلے اکثر لوگوں کا خیال تھا۔ کہ ہندوستان میں اردو زبان کا گہوارہ لکھنؤ ہے۔ لیکن اب جدید تاریخی انکشافات نے یہ صاف ثابت کر دیا ہے۔ کہ یہ فخر صرف مچھلی شہر کو حاصل ہے۔ کیونکہ مچھلی شہر لکھنؤ سے بہت پرانا

ہے۔ یہ اس وقت کا شہر ہے جب تمام کائنات سمندر میں غرق ہو گئی تھی۔ میرا مطلب طوفانِ نوح سے ہے۔ اس وقت یہاں بہت سی مردہ مچھلیاں سمندر میں ایک جگہ آکر اکھٹی ہو گئیں۔ اور یہ ڈھیر بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ یہ جگہ سمندر کی سطح سے باہر نکل آئی۔ اور پھر بہت مدت کے بعد یہ مقدس شہر آباد کیا گیا۔

یوں بھی تو یہ بہت بڑا تاریخی شہر ہے۔ یہاں باوا بم بم ناتھ کا مندر ہے جہاں ہر گیارھویں سال میلہ لگتا ہے۔ اور ہندوستان بھر کے "ننگے" سادھو یاترا کے لئے آتے ہیں۔ اور انہیں دیکھنے کے لئے لاکھوں آدمی یہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہاں مغلوں کے زمانوں کا ایک اصطبل بھی ہے۔ جہاں رہیل کھنڈ کو جاتے ہوئے مغلیہ فوج کے گھوڑے ایک رات کے لئے رکھے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو تزکِ جہانگیری صفحہ ۴۴ سطر غائب اور ہاں گھاس منڈی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ غرضیکہ مچھلی شہر ایک قابل دید تاریخی جگہ ہے۔

تو میرا کہنے کا مطلب یہ تھا۔ کہ خاکسار کے سوا مچھلی شہر کا بچہ بچہ ادیب ہے۔ لکھنؤ میں تو صرف گھسیاروں کی زبان ادبی ہے لیکن مچھلی شہر میں تو دکاندار، طالب علم، اور نواب۔ غرضیکہ ہر پڑھا لکھا شخص صحیح اور شستہ اور بامحاورہ زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔ حضرت ماہی مچھلی شہری بھی اسی خاک پاک کی پیداوار ہیں۔ ملاحظہ ہو ۔

بنتے ہیں زخم دل پہ کباب نئے نئے کھرنڈ
آتا ہے ہاتھ میں پھر کوئی ہر کاں لیے ہوئے

زخم دل پر کھرنڈ کا پیدا ہونا نہ صرف سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے صحیح ہے۔ بلکہ بامحاورہ بھی ہے۔ اور گو حضرت شاہی نظیری نے کھرنڈ کو اکثر "کھرانڈ" یا "خرنڈ" باندھا ہے۔ لیکن فصحائے مچھلی شہر کے نزدیک "کھرنڈ" ہی صحیح ہے۔

سلاست زبان اور شوخی تو حضرت ماہی مچھلی شہری کے کلام کا خاصہ ہے۔

اماں جاؤ بھی کیا اتنی سی بات ہے آہ
کر دیا جسے تم نے اک افسانہ ارے واہ

اس موضوع کو دوسرے شعرا نے بھی اپنایا ہے۔ لیکن انہیں حضرت ماہی مچھلی شہری کا انداز بیان کہاں نصیب۔ یہاں نہایت سادہ اور کوثر سے دھلی ہوئی زبان میں حضرت ماہی نے ایک عام چیز کو وہ معانی بخش دیئے۔ کہ سبحان اللہ۔ اور پھر اس میں ایک اور نکتہ بھی ہے۔ اور وہ ہے سینمائی کیفیت یہ شعر پڑھ کر آپ، گویا اپنی آنکھوں کے سامنے اس شخص کی حرکات دیکھ سکتے ہیں جس نے یہ شعر ہاتھ ہلا کر، چٹکی بجا کر اور گردن گھما کر سنایا ہوگا۔ "اماں! اتنی سی بات" اور "ارے واہ" میں ان ٹکڑوں سے ایک پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔

حضرت ماہی مچھلی کے کلام میں تصوف بہت ہے۔

آباد ہے تیرے ویرانے سے دل کا باغ
روشن ہے تیرے اندھیرے سے روح کا چراغ

یہ دنیا بہتا پانی ہے یہ مایا ڈھلتی چھایا ہے
یہ دنیا بھی اک مایا ہے وہ دنیا بھی اک مایا ہے

"یہ دنیا" اور "وہ دنیا" ان دونوں دنیاؤں کا امتزاج کس خوبی سے کیا ہے اور یہی چیز تو تصوف کی جان ہے۔

حاصل ہوا نہ ہوگا چاہ خرد کا پانی
گو لالۂ صحرائی پہ آیا سو بار پنجہ شاہیں

وحدت بحر رنگ و بو کچھ بھی نہیں
میں خدا ہوں اور "تو" کچھ بھی نہیں

یہ اشعار تعریف سے مستغنی ہیں۔

لیکن جہاں ان کے اشعار میں تصوف ہے۔ وہاں اُن کا دل وطنی جذبات سے بھی خالی نہیں۔ اور دراصل وہ تو تصوف ہی میں ہندوستان کی نجات دیکھتے ہیں۔ اس شعر کو سنئے:۔

اس غریب ملک کی قسمت پھر کبھی نہ کھوٹی ہو
جو سر پر ایک عمامہ ہو اور تن پہ ایک لنگوٹی ہو

انگریز بھی اس کا بندہ ہے ہم بھی اس کے بندے ہیں
یہ الیکشن یہ اسمبلی سب مکر و فریب کے پھندے ہیں

کیوں امیر و غریب کے یہ جھگڑے ہیں الحذر
جب موت ہے قریب اور ایک ہے قبر

حاکم و محکوم کوئی نہیں یہ سب مایا کا جال ہے
اُٹھا پردہ خرد! دیکھ سب کا ایک حال ہے

الغرض حضرت ماہی مچھلی شہری کا کلام بلاغت نظام اس قسم کے پند و نصائح سے مالا مال ہے۔ ہندوستان کا کوئی کتب خانہ اس مجموعہ کلام سے خالی نہیں۔ مضامین اچھے۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ مگر کاغذ اچھا نہیں۔ کتاب کے شروع میں جناب غور فکر آبادی۔ شور عظیم آبادی۔ دلیر فصیح آباعی اور حشر فخر آبادی کے دیباچے شامل ہیں۔ حضرت مچھلی ماہی شہری کی ایک تصویر

بھی شامل ہے۔ جس میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھے "رموزِ تصوف" کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اپنے کتب فروش سے طلب کیجئے۔ اور اگر اپنے کتب فروش سے نہ ملے۔ تو سیدھے مچھلی شہر سے منگوائیے +

میں نے جاپان میں کیا دیکھا؟

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ اچھا صاحب آپ نے جاپان میں کیا دیکھا؟
(میں جاپان کب اور کن حالات میں گیا تھا۔ اس کا تذکرہ بعد میں کروں گا)
میں ان لوگوں کو جاپان کے حالات سنا سنا کر اس قدر تنگ آ گیا ہوں اور مجھے
اب جاپان کے عوام اور اُن کی تہذیب و تمدن کے متعلق اتنی باتیں ہر روز
سنانا پڑتی ہیں۔ کہ اب میں نے خوشنودئ احباب و رفاہ عام کے لئے ان تمام
باتوں کو ان قیمتی اوراق میں محفوظ کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تاکہ ہمیشہ کے

لئے اس جھنجھٹ سے نجات پاؤں۔ دُوسری بات یہ ہے۔کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا۔جو میں قارئین کی تفنن طبع کے لئے درج کرتا ہوں:۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں استاذی مکرم فی فی پی پا کی میتت میں (اخوہ ہجّوں میں غلطی ہو گئی۔میرا مطلب ہے معیت میں) یوکوہاما پہاڑ پر سیر کرنے کے لئے گیا۔یوکوہاما پہاڑ جاپان کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔اور استاذی مکرّم فی فی پی پا پاکو یاما یونیورسٹی میں (جو کیلول پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔اور سال میں صرف نو مہینے بند رہتی ہے) طبعیات کے لیکچرار ہیں۔اس لئے سفر بہت دلچسپ رہا۔راستے میں انہوں نے مجھے جاپان کے متعلق بہت سی نئی نئی باتیں بتائیں بالخصوص جاپانی پہاڑوں کی ساخت کے متعلق مثلاً" یہ چٹان لاوے سے تیار کی گئی ہے "۔

کس نے تیار کی تھی؟ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

استاذی مکرم بڑبڑانے لگے۔

میرا مطلب یہ ہے۔" اس کا موجد کون تھا؟" میں نے جلدی سے گھبرا کر کہا۔

فی فی پی پا ہنسنے لگے۔بات یہ ہوئی، کہ میں نے گھبراہٹ میں ہندوستانی بولنی شروع کر دی۔فی فی پی پا کو اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔صرف ایک لفظ موجد

وہ سمجھ گئے۔ کیونکہ موجد جاپانی زبان میں "قدرت" کو کہتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں درست ہے۔ اس لاوے کی چٹان کو قدرت نے ہی تیار کیا تھا۔ اور اس چٹان پر ہی کیا موقوف ہے۔ یہ سب پہاڑ اور اُن کی چوٹیاں۔ یہ جیری کے پھول یہ سب قدرت نے ہی بنائے ہیں۔

الغرض بہت لطف رہا۔ راستہ بھر وہ جاپانی چٹانوں اور زمین کی تہوں کے متعلق میری معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ اس چٹان میں یہ ہے "اُس میں لوہے کی آمیزش ہے"۔ "اس میں شنگرف ہے" کبھی کبھی میں بات کرنے کے لئے پوچھ لیتا۔

اس میں شنگرف ہے؟ کیا سچ مچ اس میں شنگرف ہے؟

"ہاں! ہاں!!"

"ہاں! ہاں!! کیا" میں پوچھتا۔

ہاں ہاں شنگرف؟

ہاں ہاں شنگرف کیا شنگرف سے ملتا جلتا کسی اور قسم کا شنگرف ہوتا ہے؟

"شنگرف! شنگرف، شنگرف!" استاذی مکرم فی فی پی پا نے چیخ کر جواب دیا۔ اور ساتھ ہی زمین سے ایک پتھر اٹھا لیا۔

میں مسکرانے لگا۔ پھر فی فی پی پا بھی مسکرانے لگا۔ دراصل جاپانیوں

کی ذکا ہی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اکثر اسی حس سے مغلوب ہو کر وہ خود کشی بھی کر لیتے ہیں۔ جاپان میں اس قسم کی خود کشیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ جاپانی زبان میں اسے "ہاراکیری" کہتے ہیں۔

تو ـــ لیکن ـــ میں کیا کہہ رہا تھا۔ کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ اور اسی وجہ سے میں اپنے جاپان کے سفر کے حالات جلد قلمبند کر دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ کہ میں احباب کو جاپان کے حالات سنانے بیٹھا۔ لیکن انگلستان کے لوگوں اور اُن کی تہذیب و تمدن اور معاشرتی حالات بیان کرنے شروع کر دئے۔ جن سے اکثر اوقات میرے بیانات میں ایک عجیب تضاد سا پیدا ہو جاتا ہے جس سے کئی لوگوں کو بالخصوص اُن تمام احباب کو جو میری طرح سچائی اور عدم تشدد پر یقین رکھتے ہیں۔ روحانی کوفت ہوتی ہے لیکن امید ہے۔ کہ اب اُن تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

جاپان پہنچ کر سب سے عجیب بات جو میں نے دیکھی وہ جاپانی عورت تھی۔ داکثر لوگوں کا یہ خیال کہ جاپان میں عورتیں نہیں ہوتیں۔ بالکل غلط ہے۔ جاپانی عورتیں نہایت دلیر، قوی الجثہ اور جفاکش ہوتی ہیں۔ وہ اپنے وطن کے نام پر جان چھڑکتی ہیں۔ اپنی جان تو الگ رہی۔ وہ اپنے بیٹوں اور خاوندوں کی جانیں چھڑکنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ اس لحاظ سے وہ

ہندوستانی ماؤں کی طرح عقلمند نہیں۔ جو اپنے بیٹوں کو فوج میں بھرتی نہیں ہونے دیتیں۔ مبادا انہیں گولی نہ لگ جائے۔ دراصل جاپانی عورت کو اپنے خاوند اور بچوں سے ذرا بھی محبت نہیں ہوتی۔

جاپانی عورت ایک ڈھیلا ڈھالا "کمونو" پہنتی ہے۔ جو کشمیری چوغے کی نقل ہے۔ وہ گھر کا سب کام کاج کرتی ہے۔ اور پھر کسی دکان یا کارخانے میں ملازمت بھی کر لیتی ہے تاکہ خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ میں ٹوکیو میں کوئی پندرہ دن پروفیسر ہی ہو کے ہاں رہا۔ اُن کی بیوی صبح نو بجے ہی گھر کے سب کام کاج سے فارغ ہو کر استنا سیون رستوراں میں چلی جاتی تھی۔ جہاں وہ چھ گھنٹے ویٹرس کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔ اور چار بجے واپس گھر چلی آتی تھی۔ اور پھر چائے وغیرہ پی کر ایک دو گھڑی آرام کرنے کے بعد گھر کے دھندوں میں مصروف ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی مثالیں امرا اور متوسط طبقے میں بھی عام ہیں۔ جاپانی عورتیں اپنے گھر سے باہر کام کرنے میں ذرا نہیں ہچکچاتیں۔ اور میں تو یہ بلا تامل کہوں گا۔ کہ ہماری ہندوستانی عورتیں تو شرم وحیا کی پتلیاں ہیں۔ اور جاپانی عورتیں تو اُن کے مقابلے میں بالکل گنوار اور بدتہذیب معلوم ہوتی ہیں۔ خدا ہمارے ملک کو اس جاپانی تہذیب سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔ ثم آمین۔

جاپان والوں کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ وہ یا تو بدھ مت کے پیرو

ہیں۔ جو ہندوستان سے گیا ہے۔ یا شانو منت کے جو مشہور چینی مصلح کینفوشس کے جاری کئے ہوئے مذہب کی نقل ہے۔ عیسائیوں کے گرجے ہیں۔ آریہ سماج کا ایک مندر ہے چند مسجدیں بھی ہیں۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جاپان کے لوگوں کو مذہب سے وہ لگاؤ نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ جاپان میں "روحانیت" کی بہت کمی ہے۔ میں نے بہت سے جاپانی دوستوں سے ملاقات کی۔ وہ بھی اس کمی کو محسوس کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ اگر ہندوستان سے چند مبلغ اور پرچارک لوگ یہاں آئیں۔ تو یہ کمی جلد پوری ہو سکتی ہے۔ یہاں میں اس سلسلہ میں اُن تمام لوگوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں۔ جو جاپان کو سیدھے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان ابدا لآباد سے روحانیت کا مرکز رہا ہے۔ اور رہے گا۔ کیا یہاں سے چند ایسے جوان نہیں نکل سکتے جو جاپان کو سیدھے راستے پر لگانے کے لئے اپنی جانیں وقف کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ بہت سے صحیح الدماغ لوگ میری آواز پر لبیک کہیں گے۔ اور جاپان کو لامذہبیت کے بحرِ بیکراں میں ڈوبنے سے بچائیں گے۔

جاپان والوں کی اپنی کوئی زبان نہیں۔ جاپانی زبان دراصل چینی زبان ہی کی ایک شکل ہے اور حروف تہجی تو بالکل وہی ہیں۔ اس کے علاوہ جاپانی اسکولوں میں انگریزی بھی ایک ضروری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر جاپانی انگریزی بولنا اور سمجھتا ہے۔ وہاں سے بہت سے انگریزی اخبار

نکلتے ہیں جن کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے ۔

جاپان والوں کی اپنی کوئی تہذیب نہیں۔ کوئی کلچر نہیں۔ کوئی ایسا نیا یا پرانا عقیدہ نہیں۔ جسے وہ ہم ہندوستانیوں کی طرح دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ وہ محض نقل کرنا جانتے ہیں۔ اس معاملہ میں خودداری انہیں چھو تک نہیں گئی۔ چین سے، ہندوستان سے، مغربی ممالک سے، جہاں سے بھی انہیں کوئی چیز پسند آگئی، انہوں نے اُسے جھٹ اپنا لیا۔ اور اپنے نظام زندگی میں داخل کر لیا۔ وہ بہت جلد باز اور عجلت پسند ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کی سی سوجھ بُوجھ ان میں نہیں پائی جاتی ۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ صرف جاپان کی بُرائیاں ہی میرے پیشِ نظر ہیں۔ اب وہاں کی مفید اور دلچسپ باتیں سنئے۔ جاپان میں امیروں اور غریبوں کے درمیان وہ شدید سماجی اور اقتصادی امتیاز نہیں۔ جو دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جاپان کے وزیر اعظم کی تنخواہ ہندوستان کے ایک ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے زیادہ نہیں لیکن اس کے جواز میں یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے۔ کہ ہندوستان جاپان سے بہت بڑا ملک ہے۔ کم از کم رقبے کے لحاظ سے اور ہاں بلحاظ آبادی بھی اس لئے یہاں لازمی طور پر تنخواہ زیادہ ہونی چاہئے۔ بیشک، بیشک، میں تو اس امر کو بالکل بھول گیا۔ دیکھئے نا میرا حافظہ کس قدر

کمزور ہے۔

ایک بات مجھے جاپان میں بہت پسند آئی۔ اور وہ جاپانی گے شا ئووں کا اخلاق۔ وہ عام طور پر ہندوستانی مغنیوں کی طرح باز و ہلا ہلا کر نہیں گاتیں وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں۔ اُن کی آواز سریلی، اُن کے ترانے دردناک اور لہجہ پُر سوز ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اُن دنوں شہر کونے ٹا میں مقیم تھا۔ جو مشہور آبنائے باسفورس کے مغربی درے پر واقع ہے اور تجارتی مستقر بھی ہے۔ وہاں میری ملاقات جاپان کی مشہور گیشا شری چی چی چی لی لا سے ہوئی۔ رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی تھی۔ اور اُن کے مہمان خانے میں بہت سے لوگ جمع تھے اور اُن کا گانا سن رہے تھے۔ وہ گیت اس قدر پاکیزہ تھا۔ اور لے اس قدر میٹھی اور پُر سوز کہ میں بے اختیار رونے لگا۔ یکایک شری چی چی چی لی لا نے گانا بند کر دیا! اور حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی اب میں نے دیکھا کہ اور معزز جاپانی مہمان بھی غصہ میں بھرے ہوئے میری طرف تک رہے ہیں۔ میں نے معذرت چاہی۔ تو مجھے بتایا گیا۔ کہ میں نے جاپانی آرٹ کی زبردست توہین کی ہے۔ دراصل وہ گانا جو شری چی چی چی لی لا گا رہی تھیں آج سے دو ہزار سال پہلے جاپان کے مشہور ظریف شاعر کھچو ہو ہی ہی ستے تیار کیا تھا۔ اور جاپان کے بہترین مزاحیہ گیتوں میں سے تھا۔ اُف کس قدر کھیول ہوئی اب بھی جب کبھی وہ جاپانی گیت میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگتا ہے، میری

آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں۔ لیکن میں جاپانی آرٹ کی توہین کا خیال آتے ہی انہیں روک لیتا ہوں +

جاپانی لوگوں کو پھولوں سے عشق ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ جاپانی لوگ پھولوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ پہاڑوں پہ، میدانوں میں کھیتوں میں سڑکوں کے کنارے، باغیچوں میں۔ جہاں جاؤ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ خاصکر "چیری کا شگوفہ" تو جاپان کا "بہترین تحفہ" ہے۔ یہ صرف دن کو کھلتا ہے اور رات کو ایک کلی کی طرح بند ہو جاتا ہے اور جب پھول مرجھا جاتے ہیں۔ تو اس کی بیل میں ایک قسم کا پھل لگتا ہے۔ اُسے "رچی کو" کہتے ہیں۔ اس کا گودا بہت مزیدار ہوتا ہے۔ اس کی گٹھلی سے بٹن اور کنگھیاں بنتی ہیں۔ اور اس کا چھلکا سرخ رنگ بنانے کے کام آتا ہے۔ اور جب اس کی بیل سوکھ جاتی ہے۔ تو جاپانی کارخانے اس کی جڑ کو سکھا کر اس سے ایک خاص دوائی تیار کرتے ہیں۔ جو سنا ہے ہندوستان میں بہت بکتی ہے۔ اور غیر ممالک مثلاً افریقہ، ٹانگانیکا، فجی وغیرہ میں بھی جہاں ہندوستانی آباد ہیں۔ خوب بھیجی جاتی ہے۔

غرض جاپانیوں کو پھولوں سے بہت رغبت ہے۔ یہاں تک کہ کارخانوں میں بھی ہر مزدور کے قریب ایک پھولوں کا گملہ رکھا ہوتا ہے۔ جب بیچارا مزدور ایک دو گھنٹے کی مشقت کے بعد اضمحلال محسوس کرتا ہے۔ تو جھٹ ان پھولوں

کو سونگھنے لگتا ہے۔ اس سے اس کے تن بدن میں ایک نئی روح دوڑ جاتی ہے اور وہ پھر زیادہ تن دہی سے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کاش ہمارے ہندوستانی کارخانہ دار بھی ان جاپانی کارخانہ داروں کی تقلید کریں۔

جاپانی پھولوں کے ذکر سے خود بخود جاپانی شاعروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی رسالوں میں جاپانی شاعروں کے تذکرے پڑھ پڑھ کر انہیں دیکھنے اور اُن سے ملاقات کرنے کا شوق میرے دل میں جاپان جانے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا۔ کہ جاپان میں کسی شاعر کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں تو مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ استفسار کرنے پر معلوم ہؤا۔ کہ جاپان میں از روئے قانون شعر کہنا منع ہے۔ جاپان کا آخری شاعر ڈوڈو اولے کا تھا۔ جسے پانچ سو سال قبل از مسیح میکاڈو کے مقدس حکم سے سنگسار کر دیا گیا تھا۔

اگرچہ جاپانیوں کے اپنے ملک میں کوئی شاعر نہیں۔ تاہم وہ دوسرے ملکوں کے شاعروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان کے شاعروں کے لئے اُن کے دل میں بہت احترام ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے۔ کہ ہر ایک قوم کو اپنا اپنا کام کرنا چاہئے۔ کوئی قوم ملک فتح کرتی ہے۔ کوئی صرف شاعر پیدا کرتی ہے۔ دونو اپنی اپنی جگہ رہیں۔ تو بہتر ہو گا"۔

اور بھی پیغام ہے۔ جو میں آپ کے لئے جاپان سے لایا ہوں۔ اور یہی وہ آخری الفاظ تھے۔ جو علامہ غوغو غین نے جو جاپان میں امور خارجہ کے

بہترین ماہر سمجھے جاتے ہیں مجھے جہاز پر رخصت کے وقت کہے۔

ہاں ایک بات رہ گئی۔ اور وہ یہ کہ میں جاپان کب اور کن حالات میں گیا۔ تو اس کے متعلّق یہ عرض ہے کہ ایک دن جب میں مشہور سیاسی کتاب
"Japan must fight Britain."
یعنی "جاپان برطانیہ سے ضرور لڑیگا" پڑھ رہا تھا۔ تو یکایک میری آنکھیں جھپک گئیں۔ اور ــــ اور ــــ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ میں جاپان ضرور گیا تھا۔

باون ہاتھی

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ تری پوری کے مقام پر ہندوستان کی
سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس نے نہایت فخر سے یہ فیصلہ کیا
تھا۔ کہ کانگریس کے صدر کا جلوس باون ہاتھیوں پر نکالا جائے۔ خدا کی خلقت
پیدل چلیگی۔ لیکن کانگریس کے صدر کی گاڑی میں باون ہاتھی جوتے جائینگے۔
مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اُس سے پچھلے سال کانگریس کے صدر کا جلوس
ایک بیل گاڑی اور بارہ بیلوں پر نکالا گیا تھا۔ انہی مثالوں کو دیکھتے ہوئے میں نے

ملک کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے۔ کہ امسال صدر کے جلوس میں ایک بچہ گاڑی اور چند بکریاں شامل کی جائیں۔ تاکہ اُس قرونِ وسطےٰ کی تہذیب کہ جس کا احیا ہمارے رہنما چاہتے ہیں دوبارہ زندہ ہو سکے۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ مجھے ہاتھیوں سے نفرت ہے۔ ہاتھی ایک بہت بڑا جانور ہے۔ اور اُس زمانے کی مخلوق ہے۔ کہ جب ابھی قدرت کے تخیل میں انسان کا وجود بھی نہ گھڑا گیا تھا۔ اس لئے ہاتھی بنی نوع آدم کا بزرگ ہے۔ اور میں اس کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں۔ کہ جتنی میں اپنے اُن بزرگوں کی عزت کرتا ہوں جنہیں اس دنیا میں مجھ سے پہلے پیدا ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ ہاتھی میں کئی خوبیاں ہیں۔ خاصکر مجھے وہ منظر بہت دل کش معلوم ہوتا ہے۔ جب میں کسی ہاتھی کو کسی ندی کے درمیان کھڑا ہو کر اپنی لمبی سونڈ سے پانی کو فوّارے کی طرح اچھالتا دیکھتا ہوں۔ اس لحاظ سے ہاتھی قدرت کا شالامار باغ ہے۔ اور آگ بجھانے والا آلہ بھی۔ پچھلے وقتوں میں جب شہروں میں آگ بجھانے والی مشینیں نہ ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے مہاراجے اور پادشاہ اپنے ہاتھیوں کی سونڈوں سے بازاروں اور محلّوں میں آگ بجھانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اور اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری اس تحریر کا یہ اثر نہ ہو۔ کہ ہندوستان کی میونسپل کمیٹیاں آگ بجھانے کی برقی مشینیں ترک کر کے ہاتھی پالنا شروع کر دیں اور گڑ اور چرخہ کے ساتھ ساتھ

ہاتھی بھی پرانی تہذیب و تمدّن کا مظہر بن جائے۔

ہم ہاتھی کو قرونِ وسطیٰ کے تمدن کا ایک خوبصورت نشان سمجھ کر اُسے آثارِ قدیمہ میں شامل کر سکتے ہیں۔ زندگی کے ارتقاء کے نظریے کے ماتحت اُسے قدرت کے مشہور عجائبات میں شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن جس چیز پر مجھے اعتراض ہے۔ وہ ہے ہاتھی کو آمد و رفت کا ذریعہ بنانا، ہاتھی فی الحقیقت سواری کا جانور نہیں ہے ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کسی کوہ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھنا۔ میں اُس دن کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ جب میں آخری بار ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ راجہ صاحب کا ہاتھی تھا۔ اور ہاتھی کی پیٹھ پر چاندی کا ہودہ کسا تھا۔ بیچارے راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور ہم سب لوگ ایک ماتمی جلوس کی شکل میں شمشان گھاٹ کو جا رہے تھے۔ ہزاروں آدمی جمع تھے۔ کیونکہ ریاستوں میں ماتمی جلوس بھی اتنے ہی پُرشکوہ ہوتے ہیں، کہ جتنے شادیوں کے جلوس، نفریاں اور ڈھول بج رہے تھے۔ ہاتھی اور علَم بردار سجے ہوئے تھے۔ سنکھ پھونکے جا رہے تھے۔ اور ریاستی بینڈ بج رہا تھا۔ ہم چاندی کے ہودے میں بصد فخر و امتیاز بیٹھے ہوئے نیچے زمین پر چلنے والی رعیت کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس طرح بین کر رہی تھی۔ جیسے سچ مچ اُن کا گھر اُجڑ گیا ہو۔ ہاتھی کی خفیف سی حرکت بھی ہودے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ تبدیل کر دینے پر مجبور کر دیتی۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ

کے سفر کے بعد حالت یہ ہو گئی۔ کہ جو شخص ہودے میں سب سے آگے بیٹھا تھا۔
اب سب سے پیچھے لڑھک گیا تھا۔ غالباً سب سے محفوظ جگہ وہ تھی۔ جہاں
مہاوت خود بیٹھا ہوا تھا۔ دھت، دھت، بیری، بیری، مہاوت آرام سے بیٹھا
ہوا حکم دیئے جاتا تھا۔ اور ہمارے شانے ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر چھیلتے
ہوئے جا رہے تھے۔ ہڈیاں ٹوٹنے کو تھیں۔ اور پیٹ کا پانی اچھل کر گلے تک
آ پہنچا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ ارتھی شمشان گھاٹ کی
طرف چلی جہاں چتا تیار کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر لوگ اِدھر اُدھر گھومنے لگے،
اور مجمع بکھر گیا۔ یہاں پہنچ کر ہاتھیوں کی چال بھی تیز ہو گئی۔ یکایک ہمارے
ہاتھی نے ایک چیخ ماری اور دریا کی طرف دوڑا۔ یہ دیکھ کر لوگ خوف سے اِدھر
اُدھر بھاگنے لگے۔ کسی نے دریا میں چھلانگ لگائی تو کوئی سرکنڈوں میں جا
پھنسا۔ کئی لوگ ارتھی کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مہاوت نے ہاتھی کو قابو میں لانے
کی بہت کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ کوہ آتش فشاں کو اب قابو میں لانا بہت
مشکل تھا۔ ہاتھی نے سر کو ایک زور سے جھٹکا دیا۔ اور غریب مہاوت زمین
پر گر پڑا۔ اور ہاتھی نے اُسے سونڈ سے اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور اگر
وہ چاہتا تو اُسے پاؤں تلے بھی روند سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے اُس نے کیوں
اُس مہاوت کی جان بخشی کر دی۔ جو ہر لمحہ پیر تسمہ پا کی طرح اُس کے سر پر
سوار رہتا تھا۔

یہاں سے ہاتھی خوشی سے چیخیں مارتا ہوا دریا میں گھس گیا، دریا کو پار کر کے
دھان کے کھیتوں میں گزرتا ہوا بلا خوف وخطر ایک چھوٹی سی گھاٹی پر چڑھ گیا۔
یہاں پہنچ کر اس نے لمبے لمبے چکر کاٹنے شروع کر دئے۔ شاید وہ صدیوں تک
اسی طرح لمبے لمبے چکر کاٹتا رہا اور مسرت سے چنگھاڑتا رہا۔ شمشان گھاٹ ہم سے اوجھل
ہو گیا تھا۔ اور اس پاگل ہاتھی کے ہودے میں گویا ہم ہر لحظہ موت کے منہ میں جا
رہے تھے۔ لیکن کوئی فرد بھی ہماری مدد کو نہ پہنچا تھا۔ کون ایسا دلیر آدمی تھا۔
جو ایک پاگل ہاتھی کے ہودے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی مدد کر سکتا، بہت
دیر کے بعد گویا صدیوں کے عرصہ کے بعد ہاتھی کی چال مدھم پڑ گئی۔ شاید جوش
سرد پڑ رہا تھا، آزادی کی خواہش معدوم ہو رہی تھی۔ اُس کے چکر چھوٹے ہونے
گئے۔ اور آخر وہ ایک جگہ پر بالکل رُک گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ پھر وہ آہستہ سے مڑا۔
اور گھاٹی سے نیچے اُترنے لگا۔ گھاٹی سے اتر کر اُس نے دھان کے کھیتوں کو پار
کیا۔ اور پھر واپس دریا میں گھسا۔ اور سرکنڈوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا پھر واپس
شمشان گھاٹ میں پہنچا۔ اس عرصہ میں لوگوں نے اپنی دانست میں ہمیں مردہ سمجھ
لیا تھا۔ اور اب وہ نہایت دلجمعی سے ہمارے لئے بھی چتا تیار کر رہے تھے۔
یکایک ہاتھی کو دوبارہ واپس آتے ہوئے اور ہمیں ہودے میں زندہ دیکھ کر
وہ بہت حیران ہوئے۔ سوائے مہاوت کے اور کوئی شخص ہمیں خوش آمدید کہنے
کے لئے آگے نہ بڑھا۔ مہاوت بھی رُکتے رُکتے قدموں سے قریب آیا لیکن ہاتھی

اب سر جھکا کر چپکا کھڑا تھا۔ جیسے اپنے طرزِ عمل پہ خود ہی نادم ہو۔ مہاوت اُس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے پچکارنے لگا۔ اور اُسے پیارے پیارے ناموں سے بلانے لگا۔ میری پیاری نینا۔ سندر نینا۔ تم کتنی شریر ہو۔ واہ کیا شرارت ہے۔ ہماری تو ہووے میں ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہوگئیں۔ اور آپ کیا مزے سے فرماتے ہیں۔ سندر نینا تم کتنی شریر ہو۔ اگر کسی کی جان سے مار دینے کی کوشش محض ایک شرارت سمجھی جاسکتی ہے۔ تو میں اپنے ملک کے رہنماؤں سے درخواست کرونگا کہ وہ اس ہاتھی کی شرارت کا خیال رکھیں۔ ریاستی دنیا میں شاید انسان کی زندگی کی اس قدر قدر و قیمت نہ ہو۔ لیکن انگریزی علاقہ میں ابھی تک انسان کی جان اس قدر سستی نہیں ہے۔ کہ اُسے ہاتھی کی ایک معصوم شرارت پر قربان کر دیا جاسکے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہاتھی بطور ایک ذریعہ آمد و رفت ایک ناکارہ شئے ہے۔ سُست رفتار بھی ہے۔ اور غیر عوامی *Undemocratice* بھی، ہندوستان کے اکثر رہنماؤں کی طرح ہاتھی کا جسم بڑا اور دماغ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور اُسے یہ پتہ نہیں ہوتا۔ کہ اُس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں کی طرح وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اندھیرے میں پاتا ہے۔ اور روشنی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کے دماغ میں روشنی کی ایک کرن آجاتی ہے۔ لیکن پھر جس سُرعت سے روشنی اندر آتی ہے اُسی سُرعت

سے واپس چلی جاتی ہے اور دماغ کو بدستور تنگ و تاریک چھوڑ جاتی ہے۔
اور ہاتھی بے چارہ یہ سمجھ نہیں سکتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اور کیوں؟ اور بیچارے مہاوتوں اور آدمیوں کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اب ہاتھی کیا کریگا اور کب؟

پنجاب کا مہاراجہ جے پال محمود غزنوی سے مارا گیا۔ اور پورس نے سکندر اعظم سے شکست کھائی۔ اس لئے نہیں کہ ہندوستانی دلیر اور بہادر نہ تھے بلکہ وہ فوجی اور غیر فوجی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے شکست کھائی تو اس لئے کہ ان کے ہاتھیوں نے انہیں دغا دیا۔ بجائے اس کے کہ یہ ہاتھی ترکوں اور یونانیوں کا مقابلہ کرتے اور آگے بڑھ کر اُنہیں کچل ڈالتے۔ اُنہوں نے اپنی پیٹھ موڑ لی۔ اور اپنے ہی ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے پاؤں تلے روندا۔ اور اُن کی صف بندیوں کو تحس نحس کر دیا۔ ہندوستان کی غلامی کی تواریخ ہاتھیوں کی غداری کی تواریخ ہے۔ نہ کہ میر جعفر اور جے چند کی غداری کی تواریخ کاش ہمارے ملک کے رہنما تواریخ سے کچھ سبق سیکھ سکتے۔ انہوں نے اپنے جلوسوں میں ایک نہیں بلکہ باون باون ہاتھی استعمال کرنا شروع کئے ہیں اس کا نتیجہ ملک کے حق میں اچھا نہیں ہو سکتا۔

آخر میں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہاتھی "تشدد" کا حامی ہے۔ یا عدم تشدد" کا۔ وہ "سچائی" پسند کرتا ہے یا "فریب" تو اس کے متعلق بھی میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جہاں تک میں نے ہاتھی کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک

خدا پرست جانور ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اُسے ایک الہٰی اشارہ سمجھنا چاہیئے۔ اور مجھے تو وہ الہٰی اشارہ کبھی نہیں بھولتا جب اُس نے دریا کے پار ایک بلند گھاٹی پر چند چکّر دے کر مجھے ذہن نشین کرا دیا تھا۔ کہ مال ہستی محض ایک فریب ہے۔ اس لحاظ سے ہاتھی ایک صُوفی ہے۔ وہ ایک مہاتما ہے جو لنگوٹی سے بھی نا آشنا ہے کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ کہ اگر وہ باون ہاتھی جو کانگرس کے صدر کی گاڑی میں جوتے گئے تھے۔ اُسی الہٰی اشارے کے زیر اثر اُسے نربدا میں گھسیٹ لے جاتے تو کیا ہوتا۔ کیا ہندوستان کی تواریخ بدل جاتی۔ اے کاش یوں ہوتا۔ یوں نہ ہوتا لیکن ان باتوں کو بیکار سوچنے سے کیا حاصل۔ حقیقت یہی ہے کہ جب تک ہندوستان میں گڑھ۔ چرخہ اور ہاتھی کا اقتدار رہیگا۔ یہ بدنصیب ملک کبھی آزاد نہیں ہو سکتا ؎

سوراج سے پچاس سال کے بعد

سنہ ۲۱ء میں ایک ہندوستانی نوجوان، جس کے آباد اجداد سوراج سے بہت عرصہ پہلے برازیل کے ملک میں آبادکاروں کی حیثیت سے مقیم ہو چکے تھے، واپس اپنے وطن کو لوٹا۔ ڈیڑھ دو سال کی سیاحت کے بعد وہ پھر برازیل چلا گیا۔ وہاں پہنچکر اُس نے ایک کتاب لکھی "سوراج سے پچاس سال کے بعد" اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کی اشاعت ممنوع ہے۔ ذیل کا مضمون اسی کتاب

میں سے لیا گیا ہے)

جب ہمارا جہاز بٹیل پورا جسے انگریزوں کے عہد حکومت میں بمبئی کہتے تھے) کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ تو میرے دل میں مسرتوں اور امنگوں کا اک طوفان بپا ہو گیا۔ اپنے وطن عزیز کی درخشندہ جھلک نے میری روح پر ایک کپکپی سی طاری کر دی۔ اور وطنیت کے جذبات سے مغلوب ہو کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لب ساحل سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک عالیشان دروازہ تھا۔ جس کے اوپر دس جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نرنگا جھنڈا سبز رنگ کا جھنڈا۔ سفید جھنڈا، کیسری جھنڈا، غرضیکہ رنگا رنگ کے جھنڈے تھے۔ اور یہ سب کے سب قومی جھنڈے متصور کئے جاتے ہیں۔ سیاہ رنگ کے جھنڈے کو دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ برازیل اور دیگر ملکوں میں اسے "سوگ کی نشانی" سمجھا جاتا ہے لیکن بعد میں مجھے بتایا گیا۔ کہ یہ شہیدوں کا قومی جھنڈا ہے۔ جنہوں نے اپنے وطن کی خاطر بھوک ہڑتال کرتے ہوئے جان دی۔ ایک اور جھنڈا بھی تھا۔ جس پر کنول کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ بنگالیوں کا جھنڈا تھا۔ دراصل سوراج ملنے کے بعد ہی ہندوستان کی قومی پارلیمنٹ میں قومی جھنڈے اور زبان کے مسئلہ پر ایک زبردست بحث چھڑ گئی تھی اور عین ممکن تھا کہ یہ بحث ایک خطرناک خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لیتی۔ لیکن ہندوستان کے مقتدر رہنماؤں نے باہمی مفاہمت سے اس کا حل تلاش کر لیا تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اب ہر ہندوستانی کو اجازت تھی۔ کہ وہ اپنا

قومی جھنڈا اپنی مرضی کے مطابق بنالے۔ اور جس زبان کو چاہے اختیار کرلے۔ اس امر کا ایک نتیجہ یہ ہوا تھا۔ کہ کئی لوگ عدالت میں ایک کاغذ کے پرزہ پر محض آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کرلے جاتے تھے۔ اور حاکم کو اس نئی زبان اور تحریر پر غور کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جیسا میں آگے چل کر بتاؤنگا۔ یہ محض فروعی باتیں تھیں۔ اور اس کا ملک کے نظم و نسق اور تہذیب و تمدّن پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔

دروازے کے باہر ایک آدمی اپنے سامنے قلم۔ دوات اور "بہی" رکھے ہوئے ایک چٹائی پر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا ٹوپ اُتار کر اُسے سلام کیا۔ اُس نے چند لمحے میری جانب گھور کر دیکھا۔ پھر بولا۔

تم کہاں سے آئے ہو۔

برازیل سے۔ یہ میرا پاسپورٹ ہے۔

ہُم۔۔۔۔۔ تم ہندوستانی ہو۔

جی۔ ہاں۔ میں نے فخر سے جواب دیا۔

تم یہاں کتنا عرصہ رہنا چاہتے ہو؟

کتنا عجیب سوال تھا۔ میں نے کہا میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں ٹھہرنے کا مجھے پورا پورا حق ہے۔ چاہے چھ مہینہ رہوں۔ چاہے عمر یہیں گزار دوں۔

ہُم۔۔۔ یہ بات نہیں، تم نے اور تمہارے ماں باپ نے اپنی ساری

عمر ہندوستان سے باہر بسر کی ہے۔ تم ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہو۔ تم یہاں چھ مہینہ کے لئے ٹھہر سکتے ہو۔ اس نے پاسپورٹ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ٹھہرنے کے لئے تمہیں پٹیل پور کے حاکم اعلیٰ کی اجازت حاصل کرنا ہو گی۔

میں نے اچنبھا کہا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ یہ میرا پیدائشی حق ہے۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔ ہر ہندوستانی، ہندوستانی نہیں ہو سکتا۔ کیا تم چرخہ چلانا جانتے ہو۔

نہیں۔

تکلی پھیرنا؟

نہیں۔

سُوت کی انٹی چڑھانا؟

نہیں۔

کھڈی کا تانا بُننا؟

نہیں۔

اُس نے طنزاً کہا۔ اور تم اپنے آپ کو ہندوستانی کہتے ہو۔ مجھے ہر روز تمہارے جیسے چالاک آدمیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جو یہاں بدیشی ملکوں سے سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ ہُوں......! اچھا

مجھے بتاؤ۔ کیا تم نے کبھی اپنے ہاتھ سے اپنا کھانا بنایا ہے۔

"نہیں"

گڑ کھاتے ہو

"نہیں۔ ہمارے برازیل میں گڑ نہیں ہوتا"۔

برازیل میں گڑ نہیں ہوتا۔ اُس نے چیخ کر کہا۔ آہ۔ کیسا وحشی اور غیر متمدن ہوگا وہ ملک!"

وہ سوالات کرتا جاتا تھا اور میرے جوابات اُسی بہی میں درج کرتا جاتا تھا۔ پھر پوچھنے لگا۔ کیا تم اپنا بول و براز اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہو۔

اب چیخنے کی میری باری تھی۔ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔ شائد ایک دوبار۔۔۔۔۔ جب میں بچہ تھا۔

میں بچپن کی بات نہیں کرتا۔ اُس نے بہی میں لکھتے ہوئے کہا بچپن میں ہر شخص ہندوستانی ہوتا ہے۔

میں اس عجیب وغریب سوالات سے تنگ آگیا تھا۔ اور اس سڑی شخص سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری طرف پھر گھورنے لگا۔ میں نے پریشان ہوکر کہا۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کرو۔ اور اس دروازے کے اندر جانے دو"

اُس نے کہا۔ اچھا تم خدا میں یقین رکھتے ہو۔ یہ ایک بات تمہارے حق میں

ہے۔ اُس نے یہ امر بھی میں نوٹ کر لیا۔ پھر بولا "تم شراب پیتے ہو!"

میں نے کہا "ہاں۔ ہمارے ملک میں عام دستور ہے۔ اسے پیئے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا"

کھانا! اس نے کہا۔ ہاں خوب یاد آیا۔ تم کھانا زمین پر بیٹھ کر کھاتے ہو۔ یا میز پر بیٹھ کر۔

میز پر بیٹھ کر۔ چھری کانٹوں کے ساتھ۔

"ہم...... چھری کانٹوں کے ساتھ! اس نے لکھتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ اپنا سامان دکھاؤ۔

معمولی سا سامان تھا۔ اس نے چند منٹوں میں دیکھ لیا۔ ایک سوٹ کیس کے کونے میں اُسے چند چھریاں کانٹے مل گئے۔ اُس نے اُنہیں اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا "یہ قانون عدم تشدد کی زد میں آتے ہیں"

اب تم جا سکتے ہو! اُس نے کہا۔

جس ہندوستان کا حال میرا دادا مجھے سنایا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان نہ جانے اب کہاں ناپید ہو گیا تھا۔ میرے دادا اشتراکی تھے۔ اور سوراج سے بہت عرصہ پہلے اپنے وطن سے جلا وطن ہو چکے تھے۔ اُنہیں اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کی آشا آخری دم تک ستاتی رہی۔ میرے والد تو خیر شروع سے غیر سیاسی

مزاج رکھتے ہیں انہیں سیاست کے بجائے زراعت سے زیادہ دلچسپی ہے اس لیے انہوں نے کبھی ہندوستان آنے کی تمنا نہیں کی۔ لیکن جب مجھے ہندوستان دیکھنے کا شوق دیکھا۔ تو کہنے لگے۔ اچھا بھئی۔ جاؤ اپنے وطن عزیز کی زیارت کر آؤ۔ مگر میں نے سنا ہے کہ ملک بدل چکا ہے۔ بہت ممکن ہے وہاں تم اجنبی سے محسوس کرو گے"۔

اجنبیت! میں حیران ہوں۔ کہ موجودہ حالات کا کس انداز میں تجزیہ کروں یہ اتنا عجیب وغریب ملک ہے۔ دوسرے ممالک سے اتنا انوکھا اور الگ کہ بسا اوقات حیرت ہوتی ہے۔ کہ کیا یہ وہی ہندوستان ہے کہ جس کے متعلق میرے دادا جان اتنی دلچسپ باتیں سنایا کرتے تھے۔ اور جس کے درخشندہ مستقبل کے متعلق ان کی اتنی بڑی بڑی امیدیں تھیں۔

ہندوستان میں آکر سب سے عجیب بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی۔ کہ اخبار کوئی نہ تھا۔ دراصل کاغذ بہت کم دستیاب ہوتا تھا۔ اور وہ بھی ہاتھ کا بنا ہوا ایسا کھٹی کا غذ جو عدالتوں اور دیگر سرکاری محکموں کے لیے بھی ناکافی ہوتا تھا۔ اور اکثر کئی مقدمات کا فیصلہ اسی لیے مہینوں تک رکا رہتا تھا۔ کہ جج کے پاس فیصلہ لکھنے کے لیے کاغذ موجود نہ تھا۔ غریب مدرس بھوج پتر اور کیلے کے پتوں پہ کتابیں لکھتے تھے۔ اور طلبا انہیں زبانی حفظ کر لیتے تھے۔ صرف چند ایک رسائل از قسم شیرازہ ادبی دنیا ہمایوں وغیرہ باقی رہ گئے تھے۔ جو پیپل اور گوار کے پتوں پر چھاپے جاتے تھے۔

ہندوستان میں آکر میں نے دیکھا کہ ہر شخص ایک ہی مذہب کا پجاری ہے۔ میرے دادا مذہب کے سخت مخالف تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہندوستان کو سوراج اس لئے حاصل نہیں ہوتا۔ کہ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ غیر اقوام ہمیشہ ہمارے ملک پر قابض رہتی ہیں۔ لیکن جب ملک کے سب سے بڑے مہاتما نے اپنی روحانی طاقت کے بل پر سوراج حاصل کیا۔ تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ملک میں ماسوائے مہاتما کی روحانیت کے باقی سب مذہب مٹ گئے یہ ایک ایسا فوق الفطرت اور نادر الوقوع کارنامہ تھا۔ کہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے عقار آباد جسے پہلے پشاور کہتے تھے۔ میں ایک بوڑھے آدمی سے استفسار کیا۔ جو حسن اتفاق سے میرے دادا جان کا واقف نکل آیا۔ تو اس نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے سارا حال یوں بیان کیا۔

بات یہ ہے کہ ہندوستان کو سوراج حاصل ہونے پر عوام کے دلوں پر مہاتما کے فوق الفطرت اور اوتار ہونے پر پورا پورا یقین ہو گیا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا فقیر ہے۔ جس کی بات ٹالنا گناہ ہے۔ مہاتما کے بعد اس کے چیلوں نے (جنہیں ہم سردار کہتے ہیں) اس مت کو بہت فروغ دیا۔ اور اب تو راس راجندر سے کوہ کربلائی تک ہر شخص اس مت کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ دراصل جاپان کی طرح ہندوستان میں بھی یہ ایک وطنی مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب اس ہندوستان میں نہ کوئی ہندو ہے۔ نہ مسلمان، نہ سکھ، نہ چینی، نہ بدھ بلکہ ہر شخص اپنے آپ کو مہاتما کا بھگت کہلواتا ہے۔

شاید اسی وجہ سے میں نے ہندوستان میں مندر، مسجد، گوردوارے کہیں نہیں دیکھے۔ آہ۔ آج اگر میرے دادا جان زندہ ہوتے۔ تو اس منظر کو دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ دیہاتوں میں اور شہروں میں جگہ جگہ ان مندروں اور مسجدوں اور گوردواروں کے بجائے عالیشان عمارتیں بنی ہوئی تھیں انہیں چرخہ گاہ کہا جاتا تھا۔ ان کے اندر صبح و شام زائرین کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ چرخہ گاہ کے عین وسط میں سونے یا چاندی یا کسی قیمتی لکڑی کا بنا ہوا چرخہ نصب ہوتا جسے لوگ آ کر باری باری گھماتے تھے اور اپنی روح کو فیضان پہنچا کر واپس چلے جاتے زود الاعتقاد لوگ چرخہ گاہوں میں منتیں مانتے تھے۔ نیازیں دیتے تھے۔ چرخے کے پیر گنڈے اور تعویذ فروخت کرتے تھے۔ اور یہ تجارت بہت زوروں پر تھی۔ جیسے ہمارے ہاں عیسائی عورتیں سونے اور چاندی کے خوشنما صلیب اپنے گلے میں باندھتی ہیں۔ اسی طرح میں نے اکثر ہندوستانی خواتین کو اپنی گردنوں میں چھوٹے چھوٹے خوب صورت طلائی چرخے اور کانوں کے لئے بھی یہی چرخہ نما طلائی آویزے استعمال کرتے دیکھا ہے۔ اکثر چرخہ گاہوں میں چرخہ اور مہاتما کی مورتی ساتھ ساتھ ہوتیں۔ اور لوگ دونوں کی یکساں طور پر پوجا کرتے تھے۔ سکولوں اور کالجوں میں چرخہ چلانا نصاب تعلیم میں بطور ایک ضروری مضمون

کے شامل تھا۔ سب سے اعلیٰ چرخہ چلانے والے کے لئے "چرخاگ" کی ڈگری حاصل کرنا لازمی تھا۔ میں نے ایک چرخاگ کو دیکھا جو بہار یونیورسٹی میں سب سے اوّل رہا تھا۔ وہ سر کے بل اُلٹا کھڑا ہو کر اپنے پاؤں سے چرخہ چلا سکتا تھا! اور میں نے سُنا ہے کہ ہندوستان میں کئی ایسے آدمی موجود ہیں۔ جنہیں چرخہ چلانے میں اتنی مہارت حاصل ہے کہ اگر ان کے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیئے جائیں۔ تو وہ محض آنکھوں کی پلکوں کی مدد سے چرخہ گھما لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کو عموماً چرخہ گاہوں کا پجاری یا صُوبوں کا گورنر بنایا جاتا ہے۔

ذہنی اور سیاسی انقلاب سے کہیں بڑھکر ہندوستان میں غذائی انقلاب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی پچھتر فی صدی آبادی بکری کا دُودھ اور کھجوریں کھا کر گذارا کرتی ہے۔ اور جہاں بکری کا دودھ اور کھجوریں دستیاب ہوں وہاں سنگترے کا رس پیا جاتا ہے اور اگر سنگترے بھی نہ ملیں۔ تو محض فاقے پر زندگی بسر کی جاتی ہے! اس غذائی انقلاب سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہُوا ہے۔ کہ ملک میں لڑائی جھگڑے قطعاً معدوم ہو گئے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ بکری کا دودھ متواتر ایک مہینہ پی لینے کے بعد لڑائی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ خودکشی کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں خودکشیوں کی تعداد پہلے سے سہ چند ہو گئی ہے۔ کسان لوگ گندم، مکئی، سرسوں وغیرہ کی کاشت نہیں کرتے۔ بلکہ بکریاں پالتے ہیں۔ اور ہندوستان کے سب سے زیادہ

آباد علاقے وہ ہیں۔ جہاں کھجوریں بہت ہوتی ہیں۔ مثلاً راجپوتانہ، سندھ، اور دکن، کشمیر اور اس کے نواحی علاقوں میں جہاں نہ سنگترے ہوتے ہیں اور نہ کھجوریں۔ چند غیر مذہب کے قبایل آباد ہیں۔ جو یا تو فاقے کرتے ہیں یا کیلے، سیب اور زردآلو پچے کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع ہے۔

ہر سوموار کو خاموشی کا دن منایا جاتا ہے۔ اس دن ہندوستان سارا خاموش رہتا ہے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ اشاروں سے ایک دوسرے کو اپنے دل کی بات سمجھاتے ہیں۔ یا کاغذ پنسل کی مدد سے کام چلاتے ہیں۔ گھر کے پالتو جانور مثلاً کتے۔ بلی۔ طوطے۔ مینا گھوڑے، گدھے، بیل، بکری، غرضیکہ ہر جانور کا منہ کسی کپڑے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ تاکہ خاموشی میں خلل نہ ہو۔ اور "مون برت" کی تقدیس میں فرق نہ آئے۔

اپنے قیام کے دوران میں میں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی لوگوں کا عدم تشدد کے عقیدے پر ایک ایسا پختہ ایمان ہے۔ جو کبھی متزلزل نہیں کیا جا سکتا، یہ دلکش عقیدہ اب ان کی زندگی کا جزوِ اعظم بن چکا ہے لیکن مجھے حیرانی تو اس امر سے ہوئی۔ کہ کس طرح اس بظاہر کمزور اور بودے عقیدے نے ہندوستان کے تمام مسائل حل کر دیئے تھے۔ جب میں نے اپنے دادا جان کے بوڑھے دوست سے پوچھا۔ کہ یہ کس طرح ہوا؟ کہ ہندو مسلمان ایک ہو گئے

اور وہ تیز قسم کے اشتراکی جو اس قسم کے سوراج کے سخت دشمن تھے۔ وہ کیسے اس عدم تشدد کی لپیٹ میں آکر اپنی ہستی فنا کر بیٹھے۔ تو اُس بزرگ خضر صورت نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کہ یہ ایک لمبی داستان ہے لیکن مختصر یوں سمجھو۔ کہ عدم تشدد نے انہیں فنا نہیں کیا بلکہ وہ لوگ خود ہی فنا ہو گئے۔ بکری کا دودھ پی پی کر دو سال کے عرصے میں ہندو مسلمان کی تمیز خود بخود مٹ گئی۔ باقی رہ گئے اشتراکی۔ اُن سے ہم لوگوں نے عدم تعاون کر لیا۔ ہم نے ان لوگوں کو جان سے نہیں مارا۔ کیونکہ کسی کو جان سے مارنا عدم تشدد کے عقیدے کے خلاف ہے۔ ہاں ہم نے اتنا ضرور کیا۔ کہ ان کی زندگیوں سے عدم تعاون کر لیا۔ اور وہ بھی نہایت محبت اور پیار سے۔

وہ کیسے؛ میں نے پوچھا۔

سیدھی سی بات ہے۔ ہم ہندوستانی جب کسی کی زندگی سے عدم تعاون کر لیتے ہیں۔ تو پھر ہم اُس سے کسی طرح کی بات چیت نہیں کرتے، نہ اُسے کہیں نوکری ملتی ہے۔ نہ بازار میں اُسے کوئی چیز مل سکتی ہے۔ نہ ہی گھر پر۔ اُس کے چاروں طرف ایک خلا سی قائم کر دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ چند ہی دنوں میں یا تو اُس کا مزاج درست ہو جاتا ہے۔ اور یا وہ شخص بھوکا پیاسا مر جاتا ہے۔ اسی عدم تعاون کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں اشتراکی مر گئے۔ اور آج کہیں ڈھونڈے سے بھی اُن کا پتہ نہیں چلتا۔

لیکن یہ تو تشدّد ہے! میں نے بلند آواز میں کہا۔ صاف تشدّد ہے اور کیا؟

اُس بزرگ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا آہستہ سے بات کرو۔ اگر کسی راہ چلتے نے سن لیا۔ تو تمہاری زندگی سے بھی عدم تعاون کر دیا جائیگا۔ پھر وہ بلند آواز میں کہنے لگے۔ کیوں صاحب۔ اس میں تشدد کیا ہے؟ ہم نے انہیں قید نہیں کیا۔ پھانسی نہیں دی۔ ان کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی۔ ہم پر تشدد کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے فوج اور پولیس کو رکھنا ضروری نہیں خیال کیا۔ اور در اصل اس ملک کی فضا میں یہ دونوں محکمے غیر ضروری سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے کسی کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ منصف اور وکیل سارا دن بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ اور نکلی پھرتے رہتے ہیں کبھی کوئی دنگا فساد نہیں ہوتا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے وقت دونوں ہاتھ جوڑ لیتے ہیں۔ اور مسکراتے ہیں۔ اگر کسی سے کسی بات پر ناراضگی پیدا ہو جائے تو اُسے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ اپنی جان پر فاقہ کر کے اُس کا پرائیشچت (کفّارہ) ادا کرتے ہیں۔ ملک میں کپڑے کے کارخانے مدت سے بند ہو چکے ہیں۔ اور ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا ساری آبادی کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے کروڑوں آدمی نیم برہنہ رہتے ہیں۔ لوگ عیش و آرام کو مطلق پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے

گھروں سے کرسیاں، صوفے، گلدان، غالیچے سب نکلوا کر جلا دیئے ہیں۔ یہ لوگ زمین پر سوتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اور دن رات پرماتما کے دھیان میں مگن رہتے ہیں۔ بازاروں میں بکریاں ہیں ہیں کرتی پھرتی ہیں۔ اور اپنے مالکوں کے لئے سودا سلف خرید کرلے جاتی ہیں۔

عورتوں کی عزت و توقیر کے معاملے میں ہندوستانی سب سے بازی لے گئے ہیں۔ یہاں ہر عورت کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ گو رسمی طور پر شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کیا عورت کیا مرد ہر ہندوستانی فرد برہمچریا کے اصول کا شیدائی نظر آتا ہے۔ محکمۂ اعداد و شمار سے دریافت کرنے پر مجھے پتہ چلا۔ کہ پچھلے بیس سالوں میں سارے ہندوستان میں صرف چھ بچے پیدا ہوئے۔ یہ چھ بچے برہمچریہ کے اصول کی شاندار کامیابی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اگر ہندوستان کے کل باشندے برہمچریہ کے اصول پر اسی سختی سے کاربند رہے۔ تو وہ دن دور نہیں۔ کہ جب سارے ہندوستان میں کوئی بچہ نہ پیدا ہو سکے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پچھلے تیس سالوں میں ہندوستان کی آبادی ایک تہائی کم ہو گئی ہے۔ اور اگر یہی حال رہا تو عین ممکن ہے کہ اگلی نصف صدی تک سارا ہندوستان نردان حاصل کر لیگا۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ راس راجیندر سے لے کر کوہ کربلائی تک آپ کو کہیں بھی ایک بھی بشر نظر نہ آئیگا۔ سرد چولھے، سنسان بازار، اور ممیاتی ہوئی بکریاں ..... کتنا دلکش اور روح پرور نظارہ ہے۔

...... ہندوستان کے باسی مکتی حاصل کر کے، بیکنٹھ سدھار گئے ہیں۔ دیوتا آسمان سے پھول برسا رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے روحانی مہاتماؤں کی جے کے نعرے لگا رہے ہیں! ......

حیرت تو یہ ہے کہ ان نرالے، انوکھے اور پُرامن لوگوں کے ملک پہ دوسرے ملک کیوں حملہ نہیں کرتے؛ درحالیکہ ہندوستانیوں کے پاس نہ فوج ہے نہ اسلحہ، نہ ہوائی جہاز، شاید اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ غیر ممالک کی جنگجو اور غیر مذہب قومیں اس انتظار میں ہیں۔ کہ کب یہ ہندوستانی اپنے دوامی برہمچریہ کے فلسفے کے طفیل اس دنیا سے کوچ کر جائیں اور پھر وہ یہاں آکر اس خالی اور سونے ملک کو آباد کریں۔ جو چیز تھوڑے سے انتظار سے اور بغیر لڑائی جھگڑے کے حاصل ہو سکتی ہو۔ اُسے کشت و خون سے کیوں حاصل کیا جائے!

دو سال کی سیاحت کے بعد میں برازیل واپس چلا آیا۔ میرا جی اپنے ملک سے بہت جلد اُکتا گیا۔ وہ ملک جہاں کوئی کسی سے عشق نہیں کرسکتا جہاں لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے۔ جہاں سب لوگ سچ بولتے ہیں۔ بکری کا دودھ پیتے ہیں۔ اور لنگوٹ باندھ کر خدا کو یاد کرتے ہیں۔

مانگے کی کتابیں

کل اردو کے ایک مؤقر جریدے کے مدیر نے جن کے لئے میرے دل میں بہت عزت ہے۔ باتوں باتوں میں مجھ سے کہا۔ ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں مانگے کی کتابیں پڑھنے کی بیماری ہے۔ اسے جس طرح ہو سکے دُور کرنا چاہیئے جب تک یہ بدعادت دُور نہیں ہوتی۔ کتابوں اور رسائل کی اشاعت نہیں بڑھ سکتی۔ اور مصنّف کو اُس کی محنت کا معاوضہ نہیں مل سکتا۔ نربندا جو قریب ہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔ تو ایسی کیا تدبیر ہو سکتی

ہے جس سے یہ لعنت پڑھے لکھے طبقے سے دُور ہو جائے۔ اور لوگ کتابیں مانگ کر پڑھنا چھوڑ دیں۔ بلکہ خریدنا شروع کر دیں۔ مؤقر جریدے کے مدبر نے کہا۔ ہے تو یہ ایک ٹیڑھی سی کھیر لیکن ۔ اور یہ کہتے ہی اُن کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں۔ اور انہوں نے میز پر مکا مار کر ایک جوان آدمی کی سی آواز میں کہا۔ بھئی میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ نریندر تن کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے اور وہ سرگوشیانہ انداز میں ایک دم بول اُٹھا۔ کیا تدبیر ہے وہ۔ بتائیے نا۔

میرے خیال میں ایک لیگ بنائی جائے۔ مؤقر جریدے کے ایک مدیر نے کہا۔ جس کی شاخیں تمام ہندوستان میں ہوں۔ اِس لیگ کے کم از کم ایک لاکھ ممبر ہوں۔ ہر ایک ممبر سے ایک عہد نامے پر دستخط کرائے جائیں کہ وہ ہر مہینے کم از کم ایک روپیہ کی کتابیں ضرور خریدے گا۔ اِس طرح سے کتابوں کے نکاس کا انتظام ہو سکتا ہے اور ادب مصنفوں کو روٹی مہیا کر سکتا ہے۔

نریندر نے خوش ہو کر کہا۔ واہ۔ کیا اچھی تدبیر ہے۔ نہ جانے پہلے کسی کو کیوں نہیں سوجھی۔ اچھا مگر اس کو شروع کس طرح کیا جائے؟

میں نے کہا۔ ہاں۔ یہ شروع کرنے کی بات ذرا مشکل ہے۔ اس لیگ کا صدر کون ہو۔ قواعد و ضوابط کیا ہونگے۔ کارروائی کس زبان میں ہو گی۔ چندہ، اور چندے کا حساب رکھنے کے لئے اس دنیا میں ایک ایماندار آدمی بھی ڈھونڈنا

ہوگا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مولینا یہ کیا قصہ چھیڑ دیا آپنے؟
مولینا نے مجھے چُپ کرانے کے لئے کہا۔ عزیز من۔ تم تو ہر چیز کو ساون کے اندھے کی طرح دیکھنے کی عادی ہو۔ یہ سب باتیں تو دوستوں کی ہمدردی اور تعاون سے حل کی جاسکتی ہیں۔ پراپیگنڈے کے لئے پمفلٹ چھاپنے چاہئیں جس میں اس بات کی وضاحت کی جائے۔ کہ مانگے کی کتابیں پڑھنے کے کیا کیا نقصانات ہیں۔ دراصل میں تو اس بات کو بہت بُری طرح محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ کیوں اپنے ادب کی عملی سرپرستی قبول نہیں کرتا اگر ہم لوگ ہمت کرکے اس کام کو ہاتھ میں لے لیں تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ ان ایک لاکھ ممبروں کی مدد سے ہمارے ادب کی کایا پلٹ سکتی ہے۔
"کابا کلپ کہیے۔ یہ آج کل کا فیشن ہے جو زورناف کے بندروں سے شروع ہوا۔ اور مالویہ جی تک جا پہنچا۔ اور اب آپ اسے ادب پر آزمانا چاہتے ہیں"۔ میں نے ذرا تیز ہو کر کہا۔ "بھلا کہیں اس پمفلٹ بازی سے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کی عادات کو بدلا جاسکتا ہے۔ یہ آپ کی لیگ ایک قسم کی کاغذی جماعت بن کر رہ جائے گی آپ کسی کو عہد نامے پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ مولینا آپ بھی کیسی روحانی باتیں کرتے ہیں"؟
نریندر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آپ کسی کو کتابیں خریدنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ یہ محض ایک خیالی اور رومانوی سی تجویز

ہے۔ مولینا نے مسکراتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تمہاری تو ضدّی بچوّں کی طرح باتیں کرنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔

× × × × ×

اب میں جوں جوں اس لیگ کے قیام کے متعلق غور کرتا ہوں مجھے افسوس ہوتا ہے۔ کہ میں نے کیوں مولینا کی مخالفت کی۔ یہ لیگ اگر خارجی حالات کی وجہ سے ایک اجتہادی جماعت نہ بن سکے تو کم از کم ایک اصلاحی جماعت ضرور بن سکتی ہے۔ ٹیمپرینس لیگ کی طرح۔ انسدادِ شراب خوری کی طرح، مانگے کی کتابیں پڑھنے والوں کا بھی انسداد کیا جا سکتا ہے۔ یا کم از کم اُن کے بہتر جذبات کو اس بری عادت کے خلاف ابھارا جا سکتا ہے پمفلٹ نکالے جائیں۔ جلسے کئے جائیں۔ جلوس نکالے جائیں۔ ذرا خیال کیجئے۔ کہ شہر کے سب ادیب مل کر بازار میں سے ایک جلوس کی شکل میں گزر رہے ہیں۔ ہم سب نے کاغذ کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں جن کے اوپر موٹے موٹے حروف میں خوب صورت اور اصلاحی مقولے درج ہیں۔

"مانگے کی کتابیں پڑھنا حرام ہے"!

"ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے میں سے گزارا جا سکتا ہے لیکن مانگے کی کتابیں پڑھنے والے کو جنت کے دروازے سے نہیں گزارا جا سکتا"!

"جو مانگے کی کتابیں پڑھتا ہے، وہ ملک سے غداری کرتا ہے"۔

اور مولینا اپنی پھندنے والی لمبی کاغذی ٹوپی کو آگے بڑھا کر کہتے ہیں۔ "اللہ

چہ شوق ورے — !

ہم سب مل کر کہتے ہیں۔ "تو کتابیں پڑھا کرو!"

مولینا پھر کہتے ہیں۔ "ہم کیا چاہتے ہیں؟"

میں جواب دیتا ہوں "مانگے کی کتاب!" . . . غلطی ہوئی۔ کہنا چاہئے تھا۔

"کتابوں کی فروخت"۔ خیر اس عظیم الشان جلوس میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

نریندر چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔

"مانگے کی کتاب پڑھنے والا؟"

"مردہ باد!" ہم سب مل کر چلاتے ہیں۔ اور اس طرح سے شور و غوغا کرتا ہوا یہ جلوس بازار میں سے گزر جاتا ہے۔

اقتصادی لحاظ سے قطع نظر ایک نفسیاتی نکتہ یہ ہے۔ کہ جو لطف مانگے کی کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ انہیں خرید کر پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کتاب خرید کر آدمی ہر وقت یہی سوچنے لگ جاتا ہے کہ خدا جانے میں نے جو تین روپے خرچ کر کے یہ کتاب حاصل کی ہے۔ اچھی بھی ہے یا نہیں۔ پڑھتے وقت بھی یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ تین روپے ضائع گئے۔ کتاب کے محاسن پر نگاہ گم جاتی ہے۔ لیکن اگر کہیں ایک فقرہ بھی کھٹک گیا۔ تو بس جی جل ہی جاتا ہے "حرام زادہ ادیب بنا پھرتا ہے . . . . لکھنے کی تمیز نہیں . . . . کیا واہیات کتاب ہے . . . . اس پبلشر کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر یونہی تین روپے لٹا دیئے

...... بس ایک تاجرانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بخلاف اس کے اگر مانگے کی کتاب ہو تو جی سدا خوش رہتا ہے۔ دل میں ٹھنڈک اور آنکھوں میں طراوت آتی ہے۔ آدمی کتاب کے محاسن و عواقب صحیح طور پر پرکھ سکتا ہے۔ اس کے نقائص کو ادیب کی بشری اور فطری کمزوری یا خارجی حالات کی مجبوری پہ کہہ کر اُسے دل ہی دل میں معاف کر دیتا ہے۔ اُس کی خوبیوں کو سراہتا ہے۔ اُسے بار بار پڑھتا ہے اور اُسے لوٹا دینے سے ہچکچاتا ہے۔ ہائے کتنی اچھی کتاب ہے۔ اور پھر اسی لالچ میں اکثر اُسے گم کر دیتا ہے۔ اور پھر اس کا دست تنگ آ کر ایک اور نئی جلد خرید لیتا ہے۔ کیونکہ اُسے کتاب کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو خریدتا کیوں۔ غرضکہ مانگے کی کتاب پڑھنے سے ایک خریدار اور بڑھ گیا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں ہر شخص مانگے کی کتاب پڑھے۔ تو ہر ایک کتاب کی اشاعت کروڑوں تک جا پہنچے۔ بجائے اس کے کہ لوگ مانگے کی کتابوں کے خلاف جہاد کریں۔ یہ بہتر ہوگا کہ ایک ایسی لیگ بنائی جائے۔ جو ہر ہندوستانی کے ہاتھ میں ایک مانگے کی کتاب پہنچانے کا انتظام کرے۔ دیکھئے پھر ادب ترقی کرتا ہے کہ نہیں اور لوگوں میں صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ میں خود ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے دنیا کے بہترین ادیبوں کی کتابیں مانگ تانگ کر پڑھی ہیں۔ اور جب بھی میں خود کوئی کتاب خریدتا ہوں۔ تو مجھ سے مانگ کر پڑھنے والے دوست اُسے مجھ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لطف

کتاب میں نہیں بلکہ اُسے مانگنے میں ہے۔ محبوب میں نہیں بلکہ تمنائے محبوب میں
ہاں! اقتصادی حالات کے پیش نظر مولینا کا شکوہ صحیح ہے اور ہندوستان
کے ادیبوں کی غریبی اور مظلومی بھی ایک امر مسلم ہے۔ لیکن اس کا علاج یہ ایک لاکھ
ممبروں والی لیگ نہیں کر سکتی۔ خارجی حالات یہ ہیں۔ کہ ہندوستان میں پڑھے
لکھے لوگوں کی تعداد بلحاظ آبادی ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہیں۔ اور ان میں سے بہت
سے لوگ برائے نام پڑھے لکھے ہیں۔ جو نہ ہماری کوثر میں دھلی ہوئی زبان کو سمجھ سکتے
ہیں۔ اور نہ ساہتیہ پرشد کی ادبی مونشگافیوں کو، جو لوگ باقی رہ گئے۔ ان میں سے بہت
سے ایسے ہیں۔ جو محض اوکاڑہ منڈی اور بمبئی بھر مرچ کی روئی کا بھاؤ معلوم کرنے کے
لئے اخبار خریدتے ہیں۔ اگر کوئی رسالہ ہاتھ لگ جائے تو پہلے اُس میں شری کرشن
مہاراج کی صورت تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر نہ ملے۔ تو رسالہ پھیر دیتے ہیں۔ پھر ننھو منو
حلوائی ہیں جو اپنے گاہکوں کے لئے روز ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے ہیں۔ پھر اس
اخبار کی جو حالت ہوتی ہے۔ خدا کی پناہ۔ ایک ایک ورق الگ کیا جاتا ہے۔
کالم در کالم الگ الگ پھاڑ لئے جاتے ہیں۔ ایک گاہک لوہے کی تین ٹانگوں والی
کرسی پہ بیٹھا غٹاغٹ لسی پی رہا ہے۔ اور جناب شاد رمنگری کا سنسنی خیز افسانہ پڑھ
رہا ہے۔ دوسرا گاہک سڑک کے کنارے چارپائی پہ آسن جمائے گلگلے کھا رہا ہے
اور ساتھ ساتھ شہزادہ صاحب کے لکھے ہوئے سیاسی چٹکلے پڑھتا جاتا ہے
اتنے میں تیسرا گاہک آکر اخبار پر جھپٹا مار کر کہتا ہے "ناہیں۔ فن بینڈ کا کیا ہوا؟"

غرضیکہ شام ہونے تک اخبار سینکڑوں ہاتھوں میں سے گزر جاتا ہے اور پھر دکان بند کرتے وقت حلوائی اُسی اخبار میں باسی پکوڑیاں لپیٹ کر کسی مجھ ایسے غریب ادیب کو دے دیتا ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را

پھر وہ لوگ ہیں جنہوں نے پنشن حاصل کر لی ہے یا ٹھیکیداری سے فراغت پالی ہے اور جمع پونجی سے ایک مکان یا کوٹھی بنالی ہے۔ اور اب عاقبت کو سُدھارنے کی فکر میں ہیں۔ ان میں سے کوئی انجینئر تھا۔ کوئی پولیس افسر۔ کوئی کسی فرم کا منیجر۔ یا بنک کا ڈائرکٹر۔ یا ریٹائرڈ جج۔ اب یہ لوگ دن رات مالا جپتے ہیں اور اپنے گناہ بخشوا لینے کی تاک میں ہیں۔ انہیں مولینا کے ادب سے کیا سروکار۔ یہ لوگ خریدتے ہیں۔ رسالہ "دھرم پرکاش" یا "نورِ ایمان" چنانچہ ہندوستان میں سب سے کثیر الاشاعت رسالے بھی مذہبی رسائل اور اخبار ہیں۔ اب جو باقی رہ گئے۔ ان میں ایک کثیر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو ہمیشہ انگریزی کتابیں خریدتے ہیں۔ وہ ایک پست درجے کے انگریزی ادیب کی کتاب لیں گے۔ لیکن "ورنیکلر لٹریچر" کبھی نہیں خریدینگے۔ اس سے اُن کے حسِ ادب کی تضحیک ہوتی ہے۔ اور اب جو بچے۔ انہیں ادب سے مس تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ایک مہینہ کی مشقت کے بعد ان کی جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں ہوتا اور اگر بچ جائے تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی کتاب خرید لیتے ہیں یا کسی

سے مانگ کر پڑھ لیتے ہیں۔ میرے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ جن کا موٹروں
کا کاروبار ہے۔ ایک اور صاحب ہیں جو کسی بنک میں ملازم ہیں۔ میں جو اخبار
منگاتا ہوں اور ابھی پوری طرح نہیں پڑھ چکتا۔ کہ موٹروں والے صاحب اخبار
منگوا بھیجتے ہیں۔ وہ ابھی پوری پڑھنے نہیں پاتے کہ بنک کے بابو استدعا کرتے
ہیں کہ انہیں دفتر جانا ہے اس لئے اخبار انہیں جلد بھیج دیا جائے کبھی تو وہ اخبار
پڑھ کر واپس بھیج دیتے ہیں۔ اور کبھی ان کے ننھے کی اماں اُسے چولھے میں جھونک
دیتی ہیں۔ دراصل اخبار کا اس سے بہتر مصرف اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

دراصل مانگنے کی کتابیں پڑھنا اور مانگے کی چیزیں حاصل کرنا ہندوستانیوں
کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ یہاں صرف کتابیں ہی ادھار نہیں دی جاتیں مجھے
اپنے اس بھولے دوست کی یاد ستاتی ہے۔ جو ایک دن میرا نیا گرم سوٹ مانگ کر
لے گیا تھا۔ اور ابھی تک تنازع للبقا کے صدقے میں اُسے واپس نہیں کر سکا۔ وہ
نئی کرسی جو ہمسائے نے اپنے گھر میں بہت سے مہمان آجانے کی وجہ سے منگوالی تھی
اور جو اب مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد بھی اُسے ہمسائے کے دیوان خانے
کی زینت بن رہی ہے۔ ہندوستان میں زندگی اُدھار کے سہارے چلتی ہے۔
ساہوکار کسان کو زمین کاشت کرنے کے لئے ادھار دیتا ہے اور جہاں بک ڈپو کا مالک غریب
کلرکوں کو ناول کرایہ پر دیتا ہے۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ آبادی چالیس
کروڑ ہے اور رقبہ بہت کم اس زمین پر کالے جسموں والے انسان حشرات الارض کی

طرح چلتے ہیں۔ جیتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ آمدنی فی کس چھ پیسہ سے زیادہ نہیں یہاں ہر چیز مانگے کی ہے۔ لوگ کتابیں مانگ کر پڑھتے ہیں۔ کسان ساہوکار روپیا سے کاشت کے لئے بیج مانگتے ہیں۔ یہاں نہ صرف ناول کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔ بلکہ بیویاں بھی۔ یہاں زندگیاں گروی رکھی جاتی ہیں اور چاندی کی چند ٹکیوں کے عوض روحیں مستعار لے لی جاتی ہیں۔ ان رگوں میں پابیت اور غداری اور ذلت رچی ہوئی ہے۔ مانگے کی کتابوں کے خلاف جہاد کرتے ہو۔ لیکن کون ہے جو ان مانگے کی روحوں کے خلاف جہاد کرے گا! جو خود بک چکا ہو وہ کیا خریدیگا

مستعار چیزوں کے سلسلہ میں مجھے ایک بات یاد آگئی ہے۔ ایک دفعہ مجھے ضلع کے نواحی دیہات میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔ میرے ساتھ ایک جاٹ دوست تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔ لیکن اس نے اب تک شادی نہ کی تھی جب میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمارے علاقے میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے، خاص کر سکھوں کے زمانہ میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا۔ اس لئے عورتوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ اور اس لئے وہ ابھی تک نہیں بیاہا تھا۔ لیکن اس کے بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ اکثر اس سے اس کی بیوی مانگ لیا کرتا تھا۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ عدالتوں میں ایسے مقدمے بارہا آتے ہیں۔ جن میں ایک بدصورت ادھیڑ عمر کی عورت کو حاصل کرنے کے لئے چار پانچ قتل ہو گئے ہوں۔ اور ایسے

بھی بہت سے مقدمات ہوئے ہیں۔ جن سے پتہ چلا ہے۔ کہ جب کوئی غریب کسان جاگیردار یا ساہوکار کا سود در سود نہ ادا کر سکا۔ تو اس نے تنگ آ کر اپنی بیوی گرو رکھدی۔ ہندوستان ہر لحاظ سے ایک غریب ملک ہے۔ اس لئے یہاں مانگے تانگے بغیر جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اب جب میں ان سب باتوں پر غور کرتا ہوں۔ تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کہ میں کیسا فرشتہ سیرت ہوں۔ کہ اس ہندوستان جنت نشاں میں جہاں مانگے کی بیویاں بھی ہوتی ہیں۔ محض مانگے کی کتابیں پڑھنے پہ اکتفا کرتا ہوں۔

پانی کا گلاس

(ایک پیروڈی)

(نرنجن گھوسی کی مشہور فلم ٹریجڈی کے آخری چند منظر)

سین اٹھارہواں :-

موٹی موٹی آنکھوں والی چھوٹے قد والی ہیروئن جو پردۂ سیمیں سے باہر بھی دھوبن سی نظر آتی ہے - باغ میں چہل قدمی کر رہی ہے - چڑیاں چہچہا رہی ہیں - پھول مسکرا رہے ہیں - طوطے بول رہے ہیں - ہیروئن خوشی سے گنگناتی ہے " ایک تھا طوطا ایک تھی رانی - ایک تھا دھوبی - جس کی (آواز بلند

کرتے ہوئے چہرے کو جذبات کا حامل بناتے ہوئے، جس کی...... جس کی
(آواز دھیمی ہو رہی ہے۔ آواز میں لرزشیں۔ ہچکولے اور سسکیاں، جس کی
..... آنکھ تھی کافی........ آواز بلند کرتی ہے اور پھر یک لخت چپ ہو جاتی ہے
پیچھے سے درختوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ گزرتا ہیرو ہیروئن کی
طرف کھنچا ہوا آ رہا ہے۔ ہیروئن ضخیم موٹی ہے۔ ہیرو اتنا پتلا اور لمبے قد کا جوان
ہے کنپٹیوں اور بالوں کے لمبے لمبے خط۔ اپنی شکل وصورت چال ڈھال سے
بالکل چور معلوم ہوتا ہے۔ آہٹ پا کر ہیروئن مڑتی ہے۔

ہیروئن۔ ہائیں تم نے تو مجھے بالکل ہی ڈرا دیا تھا۔ دکھ بھنجن۔

دکھ بھنجن (معلوم ہوا کہ یہ ہیرو کا نام ہے (چھاتی پر ہاتھ رکھ کر) کس نے
ڈرا دیا تھا؟...... میں نے؟ ...... کیسے ہو سکتا ہے گلگلی؟

گلگلی (ثابت ہوا کہ گلگلی ہیروئن کا نام ہے کسی مٹھائی کا نہیں) میں گا ہی
تھی کہ تم آ گئے۔

ہیرو۔ کیا گا رہی ہو۔ میں نے دور سے سنا جیسے آسمان میں اپسرائیں گا
رہی تھیں۔ میں بھاگا بھاگا تمہاری طرف چلا آیا۔ (ہیروئن کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور موٹی بے سری آواز میں گانا شروع کر دیتا ہے) ایک
تھی دیوی ایک تھا دیوتا" پھر دفعتاً ہنسنے لگتا ہے:

کیوں ہنس رہے ہو؟

ہیرو۔ میں سوچتا ہوں گلگلی۔ کہ۔ کہ

ہیروئن۔ ہاں۔ ہاں کہو۔

ہیرو۔ کہ آج میرا اگلا کام نہیں کرتا۔ اگر میں ایک پانی کا گلاس۔

ہیروئن۔ ششش۔ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے۔

دکھ بھنجن یہ تم کیا کہہ رہے، اگر پتا جی سن پائیں تو۔ (سسکیاں لینے لگتی ہے)

دکھ بھنجن۔ (غمگین آواز میں، مجھے کھشما کرو گلگلی۔ مجھ سے بھول ہوئی (ہیرو کا گلا بھر آتا ہے۔ لیکن پانی سے نہیں۔ فرط غم سے) ہیں ——— میں ——— اب کبھی تم سے پانی ——— کا گلاس نہیں مانگوں گا۔ (گاتا ہے)

ایک ننھا نانا ایک ننھی نانی

تھالی میں روٹی گلاس میں پانی

دنیا ہے آنی جانی

(آواز میں لوچ ہے اور دور تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں

گلگلی۔ (ساڑھی کے پلّو سے اپنے اور دُکھ بھنجن کے آنسو پونچھتے ہوئے) مت رو دکھ بھنجن۔ مت رو۔ اس سنسار میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کسی کو روٹی نہیں ملتی کسی کو پانی کا گلاس۔ لیکن محبت کی جیت بھی ہار ہے

اور ہار بھی جیت۔ جہاں محبت ہے وہاں پانی کے گلاس کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے
دکھ بھنجن۔ دکھ بھنجن۔

ہیرو (اپنی لمبی تھوتھنی کو فرطِ غم سے اور بھی لمبا کرتے ہوئے) گلگلی!

ہیروئن۔ کیا کہا۔

ہیرو۔ گلگلی۔

ہیروئن آنکھیں بند کر لیتی ہے اور ہیرو کی چھاتی پر اپنا سر رکھ دیتی ہے۔

"ایک بار پھر کہنا"۔

ہیرو۔ گلگلی

ہیروئن۔ پھر کہو۔

ہیرو۔ گلگلی۔ گلگلی۔ میری جان۔

ہیروئن۔ پھر کہو۔ ہائے پھر کہو۔

ہیرو۔ (تنگ آکر) گلگلی۔ گلگلی۔ گلگلی۔

دفعتہً۔ پھر باغ کے باہر گدھوں کے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز آتی ہے۔ ہیرو اور ہیروئن دونوں کانپ جاتے ہیں۔

ہیروئن۔ پتا جی آ رہے ہیں شاید۔

ہیرو۔ (ڈھارس دیتے ہوئے) گھبراؤ مت۔ جہاں پریم ہے وہاں ڈر کیسا۔
پریم کے سائے تلے اور پریمی دل۔ ہاں پریمی پاگل دل۔

(گدھوں کے بولنے کی زور زور سے آوازیں۔ ہیرو اور ہیروئن کانپ جاتے ہیں)

ہیرو۔ (ڈر کر) چلو گلگلی کلکتے چلیں

ہیروئن۔ چلو کلکتے چلیں۔

(دونوں کلکتے جاتے ہیں۔ دو تین منٹ فلم پر گاڑی کے سین۔ ریل کی لائن الہ آباد۔ شاہدرہ۔ بھٹنڈہ۔ مددکے۔ جلوکے رکھوکے اور پھر یکایک کلکتہ)

(سین بدلتا ہے)

ایک بعید جاذب نظر ڈرائنگ روم ایک صوفے پر گلگلی خوبصورت ساڑھی پہنے رو رہی ہے۔ اور ایک خوبصورت رومال سے اپنی خوبصورت آنکھوں کے خوبصورت آنسو پونچھتی جاتی ہے۔ بیچ میں خوبصورت سسکیاں بھی لیتی ہے۔ بائیں طرف ایک کرسی پر گلگلی کا باپ سیٹھ کامتا پرشاد سامنے ایک تپائی پر جھکا ہوا اداس سا بیٹھا ہے۔ سارے کمرے پر رقت کا عالم طاری ہے۔ اس سین کو دیکھ کر بہت سے تماشائی خاص کر بوڑھے اور عورتیں اپنے اپنے رومال جیبوں سے نکال کر ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔

گلگلی۔ (صوفے سے اچھل کر یکایک چیختی ہوتی) ہائے میں نے اسے پانی کا گلاس کیوں نہ دیا۔؟

سیٹھ کامتا پرشاد ۔ (کرسی سے اچھل کر) ایسا کبھی نہ ہوگا ۔ یہ ہمارے خاندان
کی رسم کے خلاف ہے ۔ (آہستہ سے گلگلی کی طرف جاتا ہے ۔) نرم آواز
میں صبر کرو..... بیٹی ؟
گلگلی (پرے ہٹ جاتی ہے) مجھے مت چھوؤ ۔ نروئی دشٹ ۔
کامتا پرشاد (گلوگیر لہجہ میں) آہ میں تمہارا باپ ہوں (صوفے پر گر پڑتا ہے ۔
ڈاکٹر دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے)
ڈاکٹر ۔ سیٹھ صاحب بہت افسوس ہے ۔ لیکن میں پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ
سکوں گا ۔ کہ دکھ بھنجن پاگل ہو گیا ہے اسے مالیخولیا ہو گیا ہے ۔
سیٹھ کامتا پرشاد ۔ کیا کہا مالیخولیا ؟ (صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔)
گلگلی ۔ (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے خوف لہجہ میں) اسے مالیخولیا ہو گیا ہے ۔ وہ
پاگل ہو گیا ہے ۔ میرا دکھ بھنجن (آہ)
ڈاکٹر ۔ افسردہ لہجہ میں) ہاں اسے مالیخولیا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی اسے
پانی کا گلاس پینے کو نہیں دیتا ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا گلا خشک ہو رہا
ہے ۔ دم گھٹ رہا ہے وہ چلا چلا کر کہتا ہے ۔ پانی کا گلاس ۔ گلگلی پانی
کا گلاس ۔
گلگلی ۔ (فیصلہ کن لہجہ میں) میں اسے پانی کا گلاس لا کر دوں گی ۔ میں اپنی جان
پر کھیل جاؤں گی ۔ لیکن اپنے پریتم کے لئے سب کچھ کروں گی ۔ گانا شروع

ہوتا ہے۔

کوئی .... ای .... ای

.... ای لائے کہاں سے پانی کا

گلاس۔ کوئی .... ای .... ای

.... ای۔

کامتا پرشاد۔ (گنگلی کا بازو جھنجھوڑ کر) نادان لڑکی! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

(دکھ بھنجن کمرے کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ہے)

دکھ بھنجن۔ کل میں نے ایک سپنا دیکھا۔ سنتی ہو گنگلی! میں نے کیا دیکھا کہ میرے دل کی ملکہ گنگلی ایک چاندی کے گلاس میں پانی بھر کر لا رہی ہے میرے لئے۔ میرے لئے صرف میرے لئے۔

(گاتا ہے)

میں نے دیکھا اک سپنا نیارا
ہلکا ہلکا بھارا بھارا
(جھومتے ہوئے تیز سروں میں)

پانی کی مچھلی - پانی کا مچھوا
پانی کی مچھلی - پانی کا مچھوا
پانی ہی پانی سارا
جی میں نے اک دیکھا سپنا نیارا

(گانا ختم کرتے کرتے دکھ بھنجن ہنسنے لگتا ہے بہت سے تماشائی زار قطار رو رہے ہیں۔ گلگلی اسی اثنا میں ایک چاندی کے گلاس میں پانی لے آئی ہے۔

گلگلی (دھرائی ہوئی آواز میں) میری طرف دیکھو دکھ بھنجن تمہاری گلگلی سماج کے سب بندھن توڑ کر اپنے ماں باپ سے منہ موڑ کر (گانا پرشاد آگے بڑھتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اسے وہیں روک دیتا ہے) تمہارے لئے پانی کا ایک گلاس لائی ہے۔

ہیرو۔ کیا تم گلگلی ہو؟ (ہنستا ہے ہا ہا ہا) میری گلگلی۔ آخر تم آگئیں گلگلی۔

ہیروئن۔ ہاں میں آگئی۔

ہیرو۔ تم آگئیں۔ لیکن پانی نہ آیا۔ اسی جھنجھٹ میں گئی عمر یا بیت (گانا چاہتا ہے۔ لیکن گلگلی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

گلگلی۔ دکھ بھنجن۔ دکھ بھنجن

(ہیرو ہنستا ہے اور ہنستے ہنستے یک لخت پیٹ میں چھری گھونک لیتا

ہے۔ اور وہیں فرش پر گر پڑتا ہے) (چیخ مار کر اور گلاس کو میز پر رکھ کر) میرے دکھ بھنجن..... (پس منظر میں موسیقی۔ دلدوز اور درد میں ڈوبے ہوئے نغمے سنائی دے رہے ہیں سینما ہال میں سسکیوں کی آوازیں)

گلگلی۔ ہاں آج میرے پریم کی شام ہوگئی۔ میرے پریم کا سورج ڈوب گیا۔ میری الفت کی نیّا باد مخالف کے جھونکوں اور سمندر کے تھپیڑوں سے الٹ گئی۔ دکھ بھنجن میرے پیتم۔ تیری موت میں میری زندگی ہے۔ اور میری زندگی میں تیری موت میں ہمیشہ تیری یاد میں جیوں گی۔ آج میرے جیون کی انوکھی تاریکی میں تیری موت کا سنگیت ایک کنول کے پھول کی طرح مسکرا رہا ہے۔ گلاس کو میز پر سے اٹھا لیتی ہے۔ میں اس خونی گلاس کا ایک ایک قطرہ پی جاؤں گی۔ اور پی کر ہمیشہ کے لئے سکھ کی نیند سو جاؤں گی (گلاس کو منہ کی طرف لیجاتی ہے۔)

کامتا پرشاد (گھبرا کر) گلگلی۔ گلگلی۔ میری بیٹی یہ تو کیا کر رہی ہے تو مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہے۔

گلگلی (پانی پی کر گلاس خالی کر دیتی ہے) "پتا جی میں چلی (فرش پر گر جاتی ہے پس منظر میں موسیقی کے بلند نغمے اچھل رہے ہیں۔ ڈاکٹر اور کامتا پرشاد حیرانی سے دیکھتے ہیں۔

(سین بدلتا ہے)

ڈاکٹر کا اپریشن روم۔ دو لمبی میزوں پر گلگلی اور دکھ بھنجن کے جسم رکھے ہیں۔ کمپونڈر، نرس، دو تین ڈاکٹر۔ تین چار صوفے، ایک الماری میں کتابیں، غرضیکہ ایک اپ ٹو ڈیٹ اپریشن روم نظر آ رہا ہے۔

کامتا پرشاد۔ (ایک ڈاکٹر سے دھیمے لہجہ میں) ڈاکٹر صاحب! کیا......؟

ڈاکٹر۔ شش ش۔ چپ رہو۔

کامتا پرشاد (دوسرے ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب۔ میں.........

ڈاکٹر۔ ہش۔ بات مت کرو۔ گلگلی کی نبض واپس آ رہی ہے۔

کامتا پرشاد۔ آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر) "اے پرماتما......"

ایک نرس (لب پر انگلی رکھ کر) "شش...... شور نہ کرو سیٹھ صاحب"

تیسرا ڈاکٹر۔ (نرس سے) "شش...... اونچی آواز میں مت بولو۔ نرس سیٹھ صاحب کو کمرے سے باہر لے جاؤ۔

(سیٹھ کامتا پرشاد نرس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور وہ اسے ہاتھ سے تھام کر کمرے سے باہر لیجاتی ہے اور پھر فلم کے اختتام تک دونوں واپس نہیں آتے۔ شاید اگلے ریسٹوران میں چائے پینے چلے گئے ہیں)

پہلا ڈاکٹر۔ ہیلو ہریسن۔

دوسرا ڈاکٹر۔ ہیلو جونز۔

تیسرا ڈاکٹر۔ ہیلو مینھوز، لڑکا تو بچ جائے گا۔ امید ہے اور اب اس کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھو ہوش میں آ رہا ہے

(تینوں ڈاکٹر اس کے جسم پر جھک جاتے ہیں)

دکھ بھنجن (کمزور آواز میں) میں کہاں ہوں .... پانی ...... پانی

ڈاکٹر پانی کی دو چار بوندیں ٹپکاتا ہے۔ دکھ بھنجن اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ لاؤ ...... لاؤ ...... لاؤ ...... یہ میرا پیٹ کیوں باندھ رکھا ہے؟

تیسرا ڈاکٹر۔ کچھ نہیں معمولی سی خراش آگئی تھی۔

ہیرو۔ وہ کیسے؟

دوسرا ڈاکٹر۔ ہش..... گلگلی ہوش میں آ رہی ہے۔

دکھ بھنجن۔ (میز سے اچھل کر اور چلّا کر) "گلگلی۔

گلگلی۔ (آواز سنتے ہی میز سے اچھل پڑتی ہے) "میرے پینم!

(دکھ بھنجن کے گلے سے لگ جاتی ہے)

تیسرا ڈاکٹر۔ ہیلو مینھوز۔

دوسرا ڈاکٹر۔ ہیلو جونز

پہلا ڈاکٹر۔ ہیلو ہر سین۔

(تینوں ڈاکٹر ٹوپیاں اٹھا کر آہستہ سے باہر چلے جاتے ہیں۔
غالباً وہ بھی نکڑ والے ریسٹوران میں چلے گئے ہیں۔

ہیرو۔ گلگلی! میری چندر مکھی۔

ہیروئن۔ پیارے! آؤ چلیں یہاں سے کہیں دُور .... دور
جہاں آبنوڈین کی بو نہ ہو (گاتی ہے کہیں دور .... کہیں دور
.... جہاں آبنوڈین کی بو نہ ہو۔)

دکھ بھنجن کمرے سے نکل کر سامنے ایک جنگل کی طرف گلگلی کو ساتھ لئے
چل پڑتا ہے۔ غروب آفتاب کا سحر افروز نظارہ۔ ہلکی ہلکی دلفریب پس
منظر موسیقی۔ چلتے چلتے دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں

ہیرو۔ گلگلی۔ نہیں وہ دن یاد ہے جب باغ میں ....

(گانے لگتا ہے)

ایک ننھا دھوبی

ایک ننھا دھوبی

گلگلی۔ (دلکش مسکراہٹ سے) ایک ننھی دھوبن۔

ہیرو۔ ایک ننھا دھوبی۔

ہیروئن (جھوم کر) ایک ننھی دھوبن۔

ہیرو۔ ایک ننھا گھوسی۔

ہیروئن (لپک کر) ایک ننھی گھوسن۔

ہیرو۔ ایک ننھا درزی

ہیروئن (دلکش مسکراہٹ سے) ایک ننھی درزن۔

سینما ہال میں تماشائی جھوم رہے ہیں۔ کیا شاندار "ڈوئیٹ" ہے۔

کمال کر دیا۔ واللہ

(دونوں گاتے گاتے آگے چل پڑتے ہیں ایک پیپل کے درخت تلے ایک سادھو کھڑا گا رہا ہے۔

پانی میں مچھلی پانی میں مچھلی

مچھلی میں پانی مچھلی میں پانی

دنیا ہے کیا ایک باقرخانی

K. C. Dey

ہیرو اور ہیروئن گانا ختم ہونے تک سادھو کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ گانا ختم ہونے کے بعد آخری بار ہاتھ جوڑ کر آگے چل پڑتے ہیں۔ سامنے پیپل کے درختوں کے جھنڈ میں سورج غروب ہونے کو ہے۔ درختوں سے پرے سمندر کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔

گلگلی۔ (ہیرو کا بازو پکڑ کر) دکھ بھنجن ہم کدھر جا رہے ہیں۔؟

دکھ بھنجن (بے خود سا ہو گیا ہے) نہیں معلوم۔

گلگلی (حیران نگاہوں سے) کیا وہ پیپل کا درخت ہے؟
دکھ بھنجن (اسی لہجہ میں) نہیں معلوم۔
گلگلی (ایک لمبے وقفہ کے بعد دھیمے لہجہ میں) کیا وہ سورج ہے؟
دکھ بھنجن (اسی لہجہ میں) نہیں معلوم

(سورج غروب ہو جاتا ہے۔ یہ وہ سیمیں پر سیاہی آجاتی ہے
لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔)
(سینما ہال سے باہر نکلتے ہوئے)
"کمال کر دیا نرنجن گھوسی نے کمال کر دیا"
"کتنے فطری مکالمے ہیں۔ کیسے خوبصورت گانے"
"کتنا نیچرل ایکٹنگ ہے۔ شاندار ڈائریکشن"
"یہ آرٹ ہے صاحب آرٹ"۔
(لوگ ادھر ادھر جاتے ہوئے گنگنا رہے ہیں)
"ایک تھا طوطا ایک تھی دھوبن"
(جملہ حقوق محفوظ، کوئی صاحب فلم بند نہ کریں)

ہوائی قلعے

ہمایوں۔ ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء

"ہوائی قلعے" کا موضوع وہی ہے جو ہندوستانی میں "خیالی پلاؤ" کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "خیالی پلاؤ" ہندوستان کی مثالی "بھوک" کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے یہ ایک محدود سی اصطلاح ہے جس کا مرجع محض "پیٹ" ہے لیکن "ہوائی قلعے" ایک بلند اور وسیع تر بیں اصطلاح ہے۔ اور اس میں نہ صرف خیالی پلاؤ بلکہ کئی ایک اور دلکش چیزیں بھی شامل ہیں کہ جن کے وجود سے ہندوستان ابھی تک نا آشنا ہے۔ ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے "خیالی پلاؤ" میں "ہوائی قلعے" نہیں سما سکتے لیکن ہوائی قلعے میں بیٹھ کر "خیالی پلاؤ" پکائے جا سکتے ہیں۔ غور کیا

جاتے۔ تو اس لحاظ سے سارا ہندوستان ایک "ہوائی قلعہ" معلوم ہوتا ہے)

کیا آپ نے کبھی ہوائی قلعے بنائے ہیں۔؟ میں بچپن کی بات نہیں کرتا جب ساری زندگی ہی ایک ہوائی قلعہ معلوم ہوتی ہے، ماں کی گود میں جا بیٹھے اور پھر اونگھتے اونگھتے ایک دم پھر سے چڑیا بن کر باغ میں سب کے سفید سفید پھولوں پر جا بیٹھے اور وہاں سے چونچ نکال کر ماں کو ڈرانے لگے۔ دیکھو، دیکھو اماں میں کتنی اونچی جگہ پر جا بیٹھا ہوں!

اور اماں ہنس کر پڑوسن سے کہتی ہے "کس قدر بھولا ہے، نادان میری گود میں بیٹھا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بہت اونچی جگہ بیٹھا ہوں ——" اسکے بعد تمہیں پیار سے تھپک کر کہتی ہیں "سو جاؤ میرے ننھے"

—— اور تمہارا ہوائی قلعہ ٹوٹ جاتا ہے۔

یا یوں کہ رینگتے رینگتے آنگن میں چلے گئے، دیوار کے ساتھ تین اینٹیں لگا لیں، ایک تو ہے کالا کوا، وہ دیو سا جانور جو منڈیر پر بیٹھ کر اپنی خوفناک آواز میں چلایا کرتا ہے۔ اور جو کبھی کبھی تمہیں اکیلا پا کر تمہارے ننھے منے ہاتھوں سے بسکٹ چھین لیا کرتا ہے۔ دوسری اینٹ بے شک تمہاری بڑی بہن ہے جو تمہیں ہر وقت چومنے پر مصر رہتی ہے۔ جو تمہیں میٹھی بھی لگتی ہے اور تلخ بھی، میٹھی اس وقت جب کھلونے کھلاتی، ہنستے ہنساتے تمہیں ایک بارگی زور سے گلے سے لگا لیتی ہے اور تمہیں عجیب عجیب، پیارے پیارے ناموں سے

بلاتی ہے اور تلخ اس وقت جب وہ تمہیں نہلانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتی ہے۔ یقیناً تمہیں پانی پسند نہیں، آخر تم ایک خشکی پر چلنے والے جانور ہو نہ کہ پانی کی مچھلی، اور پھر وہ صابون کا نمکین جھاگ جو ناک کے نازک نتھنوں میں، آنکھ کے پپوٹوں کے اندر پہنچکر مرچیں سی لگا دیتا ہے! ـــــ پھر کس سختی سے وہ ایک کھردرا تولیہ لے کر تمہارے چھوٹے سے جسم کو صاف کرتی ہے حتےٰ کہ تمہارا سارا جسم لال ہو جاتا ہے۔ اور اس عمل کے دوران میں وہ برابر گنگناتی جاتی ہے۔ کوئی بے معنی گیت۔ اور پھر کوئی تھوڑا سا خوشبودار تیل لے کر تمہارے چھوٹے سے سر پہ اس زور سے مالش کرتی ہے۔ کہ تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ نازک سا سر ٹوٹ جائے گا۔ مگر یہ بھی تم برداشت کر لیتے ہو لیکن وہ اس پر بھی بس نہیں کرتی، بلکہ لکڑی کی ایک خاردار چھپٹی سی لے کر وہ اُسے بار بار تمہارے گھنگر یالے بالوں میں پھیرتی ہے حتےٰ کہ درد کی شدّت سے تم بلبلا اُٹھتے ہو، اور حیران ہوتے ہو کہ وہ میری میٹھی بہن کہاں گئی۔ اور یہ کون ہے جسے مجھے رُلانے میں مزہ آتا ہے۔

تیسری اینٹ۔ تمہارا سب سے بڑا بھائی ہے، وہ تمہیں شاذ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اُس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب ہوتی ہے اور آنکھوں پر ایک چمکتی ہوئی عینک، وہ تمہیں اُس وقت پیار کرتا ہے۔ جب تم بالکل اکیلے ہوتے ہو۔ پہلے وہ اِدھر اُدھر دیکھ لیتا ہے۔ کہ تم بالکل اکیلے ہو نا اور پھر تم ابھی دل ہی

دل میں حیران ہو رہے ہوتے ہو کہ یہ میرا اتنا اونچا بھائی کیا کر رہا ہے۔ اور اسکی آنکھوں پر دو گول گول سی چیزیں کیا چمک رہی ہیں کہ وہ تمہیں یکایک زمین سے اتنا اونچا اُٹھائے جاتا ہے۔ گویا تم آسمان سے جا لگے ہو۔ وہ تمہیں ہوا میں پھینک دیتا ہے۔ بہت اوپر کہ تم یکایک ڈر جاتے ہو۔ پھر وہ باہیں پھیلا کر تمہیں جھٹ آغوش میں لے لیتا ہے کہ تم خوشی سے ہنسنے لگتے ہو تمہیں ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی ہنسنے لگ جاتا ہے۔ وہ تمہیں گدگداتا ہے۔ اور تم زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتے ہو۔ جس پر وہ تم سے بھی زیادہ زور سے قہقہے لگاتا ہے۔ اس شور و غل کو سُن کر گھر کے چار پانچ افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ خالہ، اماں، باورچن، بڑی بہن اور اس کی سہیلی، پھر وہ سب مل کر بڑے بھائی پر ہنستے ہیں۔ اور بڑا بھائی شرمندہ سا ہو کر تمہیں جھٹ زمین پر اتار دیتا ہے اور بھاگ کر اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔

اب ان تین ابنٹوں ہی سے تم دن بھر کھیلتے ہو، تم بڑے بھائی کی عینک اتار لیتے ہو۔ اور اُسے ایک گائے بنا کر بہن کی چوٹی سے باندھ دیتے ہو، تم بڑی بہن کو صابون کے جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتے ہو، وہ چیختی ہے تم خوش ہوتے ہو اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہو۔ آنگن میں ایک طرف، کونے میں بیٹھی ہوئی اماں تمہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہیں اور پھر تکلی پر سوت چڑھا کر

اُسے گھماتی ہیں۔ اتنے میں وہ پہلی اینٹ جسے تم کو آ سمجھتے ہو، تمہارے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے جاتی ہے، اور تم غصّہ میں آ کر اُسے دیوار سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیتے ہو اور بسورنے لگ جاتے ہو۔

اور اماّں پوچھتی ہیں "اُداس اُداس کرتے ہو۔ ابھی تو ہنس رہے تھے"؟

× × × × × × × × ×

نہیں نہیں، میں بچپن کے ہوائی قلعوں کی بات نہیں کرتا۔ میں تم سے لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کے ہوائی قلعوں کا حال پوچھتا ہوں۔ کیا لڑکپن کی شرارتوں میں بھی تم نے بچپن کے پرانے کھیل کا اعادہ کیا ہے؟ بچپن کی زندگی تو ایک مسلسل حیرانی کی زندگی تھی۔ ابّا جان کے حقّے سے لے کر نوکرانی کی بہلی بڑھیا تک ہر چیز عجیب نظر آتی تھی۔ تم ایک مٹی کی گڑیا میں جان ڈال دیتے تھے، ایک لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر تمام دنیا کی سیر کر آتے تھے، ایک کاغذ کی ناؤ میں بیٹھ کر سات سمندر پار چلے جاتے تھے لیکن کیا لڑکپن میں تم اپنے اُس پرانے محبوب کھیل کو بھول گئے تھے؟ سچ کہنا، تم نے اپنے شریر تخیّل کی مدد سے کتنی بار سکول کی عمارت کو آگ لگائی ہے، حتیٰ کہ اُس کے شعلے آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔ کتنی بار اُس موٹے ٹھگنے استاد کو کہ جو تمہیں تاریخ پڑھاتے وقت تمہارے بازوؤں میں زور زور کی چٹکیاں لیا کرتا ہے، ایک اونچے کھجور کے درخت کے ساتھ اس طرح اُلٹا لٹکا دیا ہے کہ دنیا بھر کی کوئی کوشش اُسے نیچے اُتارنے میں کامیاب نہیں ہوئی، اور پھر سکول کے سب اُستاد،

ہیڈ ماسٹر سمیت (اور یہاں تم مسکراتے ہو!) تمہارے پاؤں بڑھتے ہیں اور تم ایک دم اچھل کر اُس اونچی کھجور کی آخری پھننگ پر پہنچ جاتے ہو اور اپنے اُستاد کو چشم زدن میں نیچے اُتار لاتے ہو اور پھر وہ عمر بھر تم سے تاریخ کے سوال نہیں پوچھتا۔

یکا یک تمہیں ہوش آجاتا ہے اور تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تم اسی موٹے ٹھنگنے تاریخ پڑھانے والے استاد کے عین سامنے بنچ پر جماعت میں بیٹھے ہو۔ اُس نے غالباً تم سے کوئی سوال پوچھا ہے مگر تم اس کا کوئی جواب دینے سے قاصر ہو، کیسے دے سکو گے، جب کہ تم ایک دل خوش کن ہوائی قلعہ بنانے میں مصروف تھے۔ کہ جس میں ایک کھجور کے درخت پر تم نے اسی اُستاد کو اُلٹا لٹکا دیا تھا تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس نے کیا سوال کیا ہے، تم لازماً خاموش رہ جاتے ہو،

پھر وہ تمہارے بازوؤں میں چٹکیاں لیتا ہے!

یا پھر ورزش کے میدان میں کھیلتے کھیلتے تمہیں یکا یک احساس ہوتا ہے کہ تم سکول کے سب سے اعلیٰ کھلاڑی بن گئے ہو، تم ہاکی کھیل رہے ہو، اور مخالف ٹیم پر گول پر گول کر رہے ہو۔ چاروں طرف شامیانے لگے ہیں اور لوگ تمہیں دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ اب آدھا وقت ختم ہو چکا ہے، اور تمہیں چائے اور رنگترے، آڑو اور کیک پیش کئے جا رہے ہیں، تمہارا ہیڈ ماسٹر

ہوائی قلعے

تمہیں شاباش کہتا ہے، یکایک سیٹی بجتی ہے اور اب تم ہاتھ میں کرکٹ کا ایک بلا لئے جا رہے ہو اور وکٹ پر پہنچ کر خوب زور سے ہٹ (Hit) لگاتے ہو، وہ مارا، گیند آسمان کی طرف اُچھلتی ہوئی میدان کو پار کر جاتی ہے اور لکڑی کے اس بڑے سے تختے پر جو میدان کے باہر لگا ہے تمہارے نمبر کے آگے "چھ" کا ہندسہ لگ جاتا ہے اور تمہارے دوست حیران ہوتے ہیں، چھ! ارے ایک ہٹ (Hit) میں چھ! تو یہ لڑکا بھی ایک آفت ہے، اسے یہ تو چھپا رُستم نکلا (اور یہاں تمہارے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے) اور تم اس طرح ہٹ پر ہٹ لگاتے ہو کہ مخالف ٹیم میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور تم لڑکوں کے کندھوں پر سوار ہو کر —

ایں یہ کیا، یہ گیند کدھر چلی گئی، یہ شور وغل کیسا؟ یہ کپتان کیوں مجھ پر خفا ہو رہا ہے، اور اب تمہیں شرمندگی سے احساس ہوتا ہے کہ جب تم گول پر کھڑے کھڑے اپنے تخیل کی رنگین دنیا میں کھیل رہے تھے۔ یکایک گیند تمہاری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر کر گول کو پار کر گئی!

کیا تم سو رہے تھے؟ (کپتان تم سے خفا ہو کر پوچھتا ہے)

تم سر جھکا لیتے ہو اور تمہارا ہوائی قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔

یا پھر یوں ہوتا ہے کہ تمہارا امتحان ہو چکا ہے۔ اور نتیجہ نکلنے والا ہے، اور تم اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہو اور یقین کر لیتے ہو کہ تم ہر مضمون میں اوّل ہو، نہ ہر مضمون ہی میں بلکہ ہر جماعت میں اوّل نکلتے ہو، آٹھویں سے نویں، نویں سے

دسویں، ایف اے، بی اے، ہر جماعت میں وظیفہ حاصل کرتے ہو، اُس کے بعد آئی سی ایس، یا اپنے شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس، وردی پہنے ہوئے، گھوڑے پر سوار، لوگ چاروں طرف سے "سلام" کر رہے ہیں اور تمہاری دستار کا سفید براق طرّہ ہوا میں لہرا رہا ہے، گھر پہنچتے ہو تو بینڈ بجتا ہے، والد فرطِ مسرت سے گلے لگا لیتے ہیں۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا دُبلا پتلا لڑکا جو تمہاری جماعت میں تم سے اوّل رہا کرتا تھا اب تمہیں کیسی حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

مگر دوسرے دن جب نتیجہ نکلتا ہے تو تمہارے ہر ہم جماعت کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تم تو محض اپنے والد کے اثر و رسوخ سے پاس ہوتے ہو۔

× × × × × × × × ×

آہ، میں تم سے جوانی کے ہوائی قلعوں کا حال کیونکر پوچھوں، میں پوچھتا ہوں وہ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں، سیپ کے موتیوں کی طرح، کتنے نازک ہوتے ہیں، پانی کے شفاف بلبلوں کی طرح، کتنے پیارے ہوتے ہیں، محبوب کی نگاہوں کی طرح، اُن کی پینگیں تمہیں عرش کی بلندیوں پر لے جاتی ہیں۔ اور دوسرے لمحہ میں زمین پر اُگی ہوئی حقیر گھاس کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ وہ دل میں سوئے ہوئے نغموں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ جذبات کے دبے ہوئے سوتوں کو اُبلتے ہوئے چشموں کی صورت میں بہا دیتے ہیں، اور لرزتی ہوئی

ہوائی قلعے

ناکام حسرتوں کو بجلیاں بنا دیتے ہیں تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم خارزار میدان میں اپنے بے ہوش محبوب کو اٹھائے ہوئے چل رہے ہو، ہر قدم پر ایک نیا کانٹا تمہارے پاؤں پر چبھ جاتا ہے اور ایک نیا گھاؤ پیدا کر دیتا ہے، مگر تم ہو کہ پرِوا نہیں کرتے، سامنے اک آگ کا دریا ہے، تم اس میں سے بھی گزر جاتے ہو تمہارے بال جھلس گئے ہیں جسم پر آبلے پڑ گئے ہیں مگر تم اپنے محبوب کو اپنے دل میں چھپائے، صحیح و سلامت، صاف بچا لے جاتے ہو، اب ٹھنڈی ہوا ہے، ایک خوشنما چمن ہے، پھولوں کی روشوں میں ایک مرمریں مسہری پر تم اپنے محبوب کو لٹا دیتے ہو، پھر تمہیں ایک سانپ ڈس لیتا ہے۔ محبوب کو ہوش آ جاتا ہے اور تم اسے دیکھتے ہوئے مر جاتے ہو!

جوانی کے ہوائی قلعے کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ اور بچپن اور لڑکپن کے قلعوں سے کتنے مختلف کئی پرانے ہوائی قلعے تھے کہ بچپن اور لڑکپن کے زرّیں عہدوں کی یادگار تھے مگر ناسازگاریٔ زمانہ سے جوانی میں آ کر معدوم ہو گئے۔ وہ بچپن کا ساتھی، گُلّی ڈنڈا کھیلنے والا ہمجولی جس کے ساتھ بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق ہوائی قلعے تعمیر کئے تھے، وہ آج کہاں ہے؟ بچپن سے لڑکپن تک وہ ساتھ دیتا آیا۔ اب یکایک عنفوانِ شباب میں کیوں اس دنیا سے رُوٹھ گیا۔ اور یکایک سارے قلعوں کو مسمار کر گیا۔ وہ الھڑ، انیلی لڑکی جس سے بڑے چاؤ چاؤ سے چھوٹی عمر میں جھوٹ موٹ بیاہ رچایا تھا۔ کیوں عین شباب کی سرمستیوں

کی سرستیوں میں ایک بالکل انجان، ناواقف آدمی کی بیاہتا بن کر چلی گئی۔ اور تمہارے کلیجے میں ناسور پیدا کر گئی، ہاں! جوانی میں آدمی بہت سے پرانے ہوائی قلعوں کو ٹوٹتا دیکھتا ہے، اور اُن کے ٹوٹنے کے ساتھ اُس کے بچپنے کی معصومیت اور لڑکپن کی شوخی اور شرارت بھی رخصت ہوتی جاتی ہے۔

لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو بچشم پُرنم خیرباد کہی وہاں تم نے بہت سے نئے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی۔ تم نے اپنی سانولی محبوبہ کی رنگت کو چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا۔ اپنی گرتی ہوئی پسماندہ قوم کو یکایک دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ طاقتور قوموں کے زمرے میں بٹھا دیا۔ اپنے غریب مُلک کے جھنڈے کو اتنا بلند کر دیا کہ کائنات کی کل وسعتیں اُس کے سائے تلے آ گئیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تیار کیا۔ اور اپنے کیرکٹر کو اتنا سنوارا کہ نوعِ انسان نے متفقہ ووٹ سے تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ تم دنیا کے سب سے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نویس، سیاست دان، سپاہی، حکیم اور مصلح کہلائے اور شہرتِ دوام کا تاج تمہارے سر پہ رکھا گیا!

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمہاری آنکھ اس وقت کھلی۔ جب تم یک حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے، ایک حقیر سے مشاہرے پہ ملازم ہوئے، تمہارے ماں باپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اور تمہارے

پتلے ایک چڑچڑی اور بے حد وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبت کے سوتے خشک ہو گئے، پھونس کے جھونپڑے جل گئے، اور تمہارے ملک وقوم غریب تر ہوتے گئے!

x x x x x x x x x x

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے، جوانی کے بعد پیری آئی، اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے، اپنے لئے کچھ باقی نہیں اب توجہ دوسروں کی طرف ہے، بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لئے بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے، اپسرائیں ناچ رہی ہیں۔ اور اس کے خوبصورت داماد نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا ہے۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دنیا بھر کے گنٹھیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ کیونکہ دادا کو خود گنٹھیا مرض ہے اور وہ ڈاکٹروں کو فیس دیتے دیتے تنگ آ گئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں، وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں مگر گنٹھیا سے نہیں ناچ سکتے، وہ گانا چاہتے ہیں مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے

ہوائی قلعے

سُننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے پھر
چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا، یا روشنی ہی روشنی، یا پانی ہی پانی، پھر اُنہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سمٹ رہے ہیں، سکڑتے ہوئے، سمٹتے ہوئے صرف
ایک ذرّہ بن کر رہ گئے ہیں، اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرّہ، روشنی کی ایک چھوٹی
سی کرن، پانی کی پتلی سی لہر۔

اس طرح ہوائی قلعے بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے۔